الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحیدالدین خان
صدر اسلامی مرکز

اگر تم خدا کو پانا چاہتے ہو
تو سب سے پہلے
اپنے آپ کو کھونے کی کوشش کرو۔

دسمبر ۱۹۹۳ شمارہ ۲۰۵

Rs. 6

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۴، شمارہ ۲۰۵

اہم اعلان

بمبئی میں علماء کنونشن جو ماہ نومبر میں طے تھا۔ بعض ناگزیر وجوہات کی وجہ سے مزید کچھ عرصہ کے لیے موخر کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری اطلاع آئندہ اشاعتوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 □ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

لاعیش الا عیش الآخرۃ

قرآن میں مختلف انداز سے جنت کی راحتوں سے بھری ہوئی زندگی کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ایک مقام پر جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے : نعم الثواب وحسنت مرتفقا (وہ کیسا اچھا انعام ہے اور کیسی اچھی رہنے کی جگہ) الکہف ۳۱

ہر آدمی خوشی اور آرام کی زندگی چاہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہر طرف خوشی اور آرام کے سامان پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی پوری طاقت ان چیزوں کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ مگر جب وہ ان چیزوں کو حاصل کر لیتا ہے تو اس پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اب وہ جانتا ہے کہ راحت کے ہر قسم کے سامان کے باوجود وہ راحت کی زندگی سے محروم ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو سامانِ راحت کو تلاش کرنے کی خوشی تو ملتی ہے مگر سامانِ راحت سے متمتع ہونے کی خوشی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں راحت کا صرف تعارف ہے، راحت سے تمتع (enjoyment) موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن نہیں۔ راحت سے متمتع ہونے کے لیے ایک کامل دنیا درکار ہے۔ موجودہ دنیا ایک ناقص دنیا ہے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص یہاں راحت سے متمتع ہو سکے۔

آدمی کے اس مطلوب کو پانے کا مقام صرف آخرت ہے۔ آخرت ایک کامل دنیا ہوگی۔ وہاں راحت کے تمام سامان اپنی آخری معیاری صورت میں فراہم کیے جائیں گے۔ یہ دنیا وقتی نہیں ہوگی بلکہ ابدی ہوگی۔ اسی کے ساتھ خود انسان کی وہ تمام محدودیتیں (limitations) ختم کر دی جائیں گی جو سامانِ راحت سے حقیقی تمتع میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ان انتظامات کے بعد پہلی بار انسان کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ اپنی پسند کی زندگی کو بھرپور طور پر پا سکے۔

آخرت کے لیے عمل کرنا اس شخص کے لیے ممکن ہوتا ہے جو حقائقِ مادی کے بجائے حقائقِ معنوی کو اہمیت دے۔ جو دکھائی دینے والی چیزوں سے گزر کر نہ دکھائی دینے والی چیزوں میں جی لگائے۔ جو آج کے فائدے کے مقابلہ میں کل کے فائدہ کو ترجیح دے۔ جو اپنی ذات میں گم ہونے کے بجائے خدا میں گم ہو جائے۔

انسان جاگ اٹھا

۲۴ جنوری ۱۹۹۳ کو میں جبل پور میں تھا۔ یہاں ناگپور کے جناب عبد السلام اکبانی (پیدائش ۱۹۴۷) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

عبد السلام اکبانی صاحب (Tel. 0712-41241) نے ۱۹۹۰ میں ناگپور کے ایک ہندو پربھاکر ہزارے سے ۶ لاکھ روپے میں ایک زمین کی خریداری کا معاملہ کیا۔ طے ہوا کہ عبد السلام صاحب بطور ایڈوانس ۲ لاکھ روپیے مالک کو دے دیں گے۔ چھ ماہ بعد رجسٹری ہوگی اور اسی وقت بقیہ رقم ادا کردی جائے گی۔ دو مہینے کے بعد مالکِ زمین نے کچھ وجہ بتا کر دو لاکھ روپے اور وصول کرلیا۔ اب مالکِ زمین کے ہاتھ میں چار لاکھ روپے آگیا۔ اس درمیان میں زمین کی قیمت بڑھ گئی۔ اس کے بعد مالک زمین کا ارادہ بدل گیا۔

چھ مہینے کے بعد عبد السلام صاحب نے مالک زمین سے کہا کہ اب مقرر وقت پورا ہوگیا ہے اب زمین کی رجسٹری کرادو۔ مگر وہ حیلے والی باتیں کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ ابھی ہمارا ارادہ رجسٹری کرنے کا نہیں ہے۔ اس طرح وہ برابر رجسٹری کے معاملہ کو ٹالتا رہا۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ عبد السلام صاحب کا چار لاکھ روپے تو میرے پاس موجود ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ عدالت میں میرے خلاف کیس کریں گے۔ میں مقدمات کا ماہر ہوں۔ ان کو عدالت میں دوڑاتا رہوں گا۔ آخر کار وہ مجبور ہو کر میری شرطوں پر صلح کریں گے۔

ایک روز عبد السلام صاحب مسٹر ہزارے کے یہاں پہنچے۔ اس وقت وہاں ان کے سسر مسٹر ساورکر بھی موجود تھے۔ ان کا آر ایس ایس سے گہرا تعلق تھا۔ مسٹر ساورکر نے کچھ دل خراش باتیں کہیں۔ آخر میں یہ کہا کہ آپ کیا کرسکتے ہو۔ آپ یہی کروگے کہ ہمارے خلاف کورٹ میں جاؤ گے۔ اور اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم آپ کی چپلیں گھسوا دیں گے۔

عبد السلام صاحب نے کہا کہ آپ میری چپلیں جب گھسواؤ گے جب کہ میں کورٹ میں جاؤں۔ مگر میں کورٹ میں جاؤں گا ہی نہیں۔ پھر آپ کیسے میری چپلیں گھسواؤ گے۔ مسٹر ساورکر نے کہا کہ پھر آپ کیا کریں گے۔ عبد السلام صاحب نے کہا کہ میں خود آپ کو ثالث بناؤں گا۔ ایک

طرف آپ کا داماد ہے۔ دوسری طرف آپ کا یہ بھتیجا ہے۔ اب آپ کو جو ٹھیک لگے اس کا فیصلہ کر دو۔

مسٹر ساورکر کی بیوی اندر بیٹھی ہوئی اس گفتگو کو سن رہی تھی۔ اس نے اشارہ سے مسٹر ساورکر کو بلایا۔ اندر کچھ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد مسٹر ساورکر باہر آئے تو وہ بدلے ہوئے تھے۔ اتنے میں مسٹر ساورکر کی بیوی اندر سے چائے لے کر آ گئی۔ مسٹر ساورچپ چاپ چائے پیتے رہے۔ اس کے بعد کہا کہ اچھا آپ کل آجائیے۔ ہم کل ہی آپ کا فیصلہ کرا دیتے ہیں۔ اگلے دن عبدالسلام صاحب وہاں گئے تو مسٹر ساورکر خود اپنی گاڑی پر لے کر انھیں رجسٹرار آفس گئے۔ وہ اثر رسوخ والے آدمی تھے۔ چنانچہ انھوں نے کوشش کر کے اسی دن زمین کی رجسٹری کرادی۔ عبدالسلام صاحب نے صرف طے شدہ رقم ادا کی۔

اس کے بعد مسٹر ساورکر کا یہ حال ہوا کہ جب بھی وہ سڑک پر ملتے تو گاڑی روک کر عبدالسلام صاحب کو حسب قاعدہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے اور خیریت پوچھتے۔ ایک روز عبدالسلام صاحب اپنے کسی کام سے ہاؤسنگ فائنینس بورڈ کے دفتر میں گئے۔ اتفاق سے وہاں مسٹر ساورکر بھی موجود تھے۔ مسٹر ساورکر نے جب عبدالسلام صاحب کو دیکھا تو بورڈ کے ڈائرکٹر سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا : میں نے مسلمان تو بہت دیکھے مگر بڈھے آدمی کا جوان باپ ایک ہی بار دیکھا۔ اور وہ یہ عبدالسلام ہے۔ اس نے میرے کو بہت بڑا سبق سکھایا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ آدمی اگر کسی سے مقدمہ نہ لڑے تو کورٹ میں اس کی چپلیں بھی گھسنے والی نہیں ہیں۔

مسٹر ساورکر اگرچہ آر ایس ایس سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے وہ ایک انسان تھے۔ عبدالسلام صاحب نے ان سے جب یہ کہا کہ میں آپ کا بھتیجا ہوں اور یہ آپ کا داماد ہے۔ آپ خود ہی ثالث بن کر دونوں کے درمیان فیصلہ کر دو، تو انھوں نے اپنے اس قول سے مسٹر ساورکر کے "انسان" کو جگا دیا۔ اور جب کسی کے اندر کا انسان جاگ اٹھے تو وہ ہمیشہ انصاف ہی کا فیصلہ کرتا ہے۔ کسی کا انسان ظلم اور بے انصافی کا فیصلہ کرنے پر قادر نہیں۔

ایک تشریح

مشہور حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے اس کو برا کہے۔ اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو دل میں اس کو برا سمجھے، اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی پر صبر کرنا رخصت کی بات ہے، وہ مومن کے لیے عزیمت یا اعلیٰ درجہ کی پسندیدہ بات نہیں۔

دوسری طرف قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر فرمایا گیا ہے کہ صبر کرو، کیوں کہ صبر کرنا عزیمت کی بات ہے۔ وہ اولوالعزم پیغمبروں کا طریقہ ہے (الاحقاف ۳۵) یہ دونوں باتیں بظاہر ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ پھر ان کے درمیان تطبیق کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ دونوں حکم الگ الگ موقع کے لیے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو حدیث ہے، اس کا تعلق مسلم سوسائٹی سے ہے۔ اور صبر کی مذکورہ آیتوں کا تعلق غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ سے۔ دونوں حکموں کا محل ایک دوسرے سے جدا ہے۔

مسلم معاشرہ کی داخلی اصلاح کے لیے یہ مطلوب ہے کہ ہر مسلمان کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ موجود ہو۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر زیادتی کرے تو پورا معاشرہ اس کا سخت نوٹس لے۔ لوگ ظالم کا ہاتھ پکڑنے کے لیے دوڑیں۔ زبان سے اس کی مذمت کریں۔ اور بالفرض کوئی مسلمان ایسا کرنے کی حالت میں نہ ہو تو اس قسم کا واقعہ دیکھ کر اس کے دل میں سخت کراہت پیدا ہونی چاہیے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو ایسے آدمی کا ایمان ہی مشتبہ ہو جائے گا۔

مگر جہاں تک دعوت کے عمومی کام کا تعلق ہے، اس میں عزیمت یہی ہے کہ صبر کیا جائے۔ یہاں مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اگر مدعو کی زیادتیوں پر صبر نہ کیا جائے تو داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا ہی نہیں بنے گی جو دعوتی عمل کی صحیح انجام دہی کے لیے ضروری ہے۔

قرآنی ہدایت

قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا جن کو لوگ پکارتے ہیں ان کو تم برا نہ کہو۔ ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر بے علمی کی بنا پر اللہ کو برا کہنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نظر میں اس کے عمل کو خوش نما بنا دیا ہے (الانعام ۱۰۹)

لوگوں نے اللہ کے سوا جو معبود بنائے ہیں، ایک توحید پرست اگر ان میں سے کسی معبود کو برا کہے تو اپنے خیال کے مطابق وہ ایک بری چیز کو برا کہہ رہا ہوگا۔ لیکن دوسرے لوگ چونکہ اس کو معبود برحق فرض کیے ہوئے ہیں اس لیے وہ بھڑک اٹھیں گے اور جھوٹے معبود کی حمایت میں سچے معبود کو برا کہنا شروع کر دیں گے۔

اس سے اجتماعی معاملات میں اسلام کا ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں مومن کو ایسا نہیں کرنا ہے کہ ایک عمل اگر قانونی اعتبار سے درست ہے تو اس کو وہ فوراً کر گزرے۔ بلکہ اس کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ دوسروں کی طرف سے اس کا کیا رد عمل سامنے آئے گا۔ اگر دوسروں کی طرف سے برا رد عمل سامنے آنے والا ہو تو مومن پر لازم ہے کہ ایسے عمل سے مکمل پرہیز کرے۔

اس قرآنی حکم کی روشنی میں دیکھا جائے تو انڈیا کے مسلمانوں نے بار بار اس کے خلاف کیا ہے۔ مثلاً ۱۹۴۷ کے بعد مسلمانوں نے مسلم یونی ورسٹی کے مسئلہ پر احتجاجی تحریک چلائی۔ اپنے نزدیک وہ اپنے ایک دستوری حق کے لیے لڑ رہے تھے۔ مگر انتہا پسند ہندوؤں نے اپنے ذہن کے مطابق اس کو یہ حیثیت دی کہ مسلمان دوبارہ یہاں ایک منی پاکستان بنانا چاہتا ہے۔ مسلمانوں نے شاہ بانو کے معاملہ میں احتجاجی تحریک چلائی۔ وہ سادہ طور پر سمجھتے تھے کہ وہ مداخلت فی الدین کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں مگر ہندو انتہا پسندوں نے اپنے ذہن کے مطابق، اس کا یہ مطلب سمجھا کہ مسلمان اس ملک میں ایک ایسے امتیازی گروہ کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں جن کو یہ حق ہو کہ وہ جب چاہیں عدالتی حکم کو ماننے سے انکار کر دیں۔

اسلامی عمل وہ ہے جس کا نقشہ نتیجہ کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہو۔

احیاء ملت

احیاء امت کا کام اصلاً احیاء افراد کا کام ہے۔ یہ کام اسٹیج کی تقریروں اور جلسہ جلوس کے ہنگاموں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کو جماعتی اور تنظیمی ڈھانچہ بنا کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کام کے لیے خاموش قسم کی فکری مہم درکار ہے جس کو موثر ترین سطح پر اٹھایا جائے اور اس کو ہر طرف سے یکسو ہو کر مسلسل چلایا جاتا رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے اندر مطلوبہ ذہنی انقلاب آجائے۔ امت میں نئی سوچ اور نیا مزاج رکھنے والے افراد پیدا ہو جائیں۔

یہ افراد وہ ہیں جو اسلام کو از سر نو دریافت کریں۔ جن کی معرفت اتنی بڑھے کہ براہ راست خدا سے ان کا اتصال قائم ہو جائے۔ صبح و شام ان کو رزق رب ملنے لگے۔ پوری دنیا ان کے لیے ایمانی غذا کا دستر خوان بن جائے۔ آخرت کا استحضار ان کے اوپر اتنا طاری ہو گویا کہ وہ جنت اور جہنم کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ ان کی زندگی عمل صالح کا نمونہ بن جائے۔ وہ اس احساس کے ساتھ بولیں کہ ان کے الفاظ انسانوں تک پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کریں یہ سوچ کر کریں کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے مالک کائنات کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ان کا ایک شخص جب دوسرے شخص کے ساتھ معاملہ کرے تو اس کو نظر آرہا ہو کہ ان کے ساتھ ایک تیسرا بھی شریک ہے اور وہ اللہ ہے۔

ایمان کے اثر سے ان کا شعور اس طرح جاگ اٹھے کہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھنے لگیں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ وہ دلیل اور مغالطہ کے درمیان تمیز کرنے لگیں۔ وہ شعوری طور پر جان لیں کہ کب دو چیزوں میں ظاہری مشابہت کے باوجود فرق ہوتا ہے اور کب دو چیزوں میں ظاہری فرق کے باوجود مشابہت۔ وہ عسر کے حالات میں یسر کے سرے کو پالیں۔ وہ اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ مومن بننے کے بعد ان کی حیثیت داعی کی ہو چکی ہے اور بقیہ لوگوں کی حیثیت مدعو کی۔ اور جہاں دو گروہوں کے درمیان داعی اور مدعو کی نسبت قائم ہو جائے وہاں سارا معاملہ یک طرفہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مدعو کے اوپر داعی کا کوئی حق نہیں، اس کی صرف ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں جن کو اسے آخری حد تک ادا کرنا ہے اور ان کو ادا کرتے ہوئے اسے اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔

دعوہ کلچر

اسلامی کلچر حقیقۃً دعوہ کلچر ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اسلام کو گن کلچر کے ہم معنی بنا دیا ہے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑا جرم ہے جو موجودہ زمانہ کے کچھ نام نہاد انقلابی مفکرین کی رہنمائی میں مسلمانوں کا ایک طبقہ انجام دے رہا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ مسلمان اقوام عالم کے اوپر رحمت کی بارش برسائیں۔ مگر وہ اقوام عالم کے اوپر آگ کی بارش برسانے والے بنے ہوئے ہیں۔ اس قسم کا عمل خواہ کتنا ہی زیادہ اسلام کے نام پر کیا جائے وہ بلاشبہ باطل ہے، وہ خدا کے منصوبہ کے سراسر خلاف ہے۔

یہ دنیا کیا ہے۔ دنیا جنتی انسانوں کی انتخاب گاہ ہے۔ قیامت سے پہلے کے مرحلہ میں جنتی انسانوں کا انتخاب کیا جا رہا ہے، قیامت کے بعد کے مرحلہ میں جنتی انسانوں کو جنت کی ابدی آرامگاہوں میں بسایا جائے گا۔ یہ حقیقت قرآن میں آخری حد تک واضح ہے، بشرطیکہ آدمی سنجیدگی کے ساتھ قرآن پر غور کرے۔

قرآن بتاتا ہے کہ زمین و آسمان اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ اولوالالباب اس کو دیکھ کر آیات خداوندی کا ادراک کر سکیں (آل عمران ۱۹۱-۱۹۰) انسان کو اس لیے تخلیق کیا گیا ہے تاکہ امتحانی حالات میں ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ ان میں سے کون ہے جو جنت کی نفیس فضاؤں میں بسائے جانے کے لائق ہے (الملک ۲) اللہ کے پیغمبر اس لیے بھیجے گئے تاکہ وہ انسانوں کو ہدایت کا وہ راستہ بتائیں جو انھیں جنت میں لے جانے والا ہے (ابراہیم ۱)

زمین و آسمان کی کائنات اس لیے پھیلائی گئی ہے کہ انسان اس کو دیکھ کر خدا کی بے پناہ کبریائی کو محسوس کرے، وہ خدا کے عظمت وجلال کے احساس سے کانپ اٹھے۔ دنیا میں رنگ اور خوشبو اور راحت اور معنویت کا سیلاب اس لیے بہایا گیا ہے کہ آدمی ان کے اندر خدا کی عنایتوں کو دیکھے، وہ ہمہ تن خدا کی رحمتوں کا طلب گار بن جائے۔ حق کے داعی اس لیے کھڑے کیے گئے ہیں تاکہ ان کا اعتراف کرکے آدمی صاحب معرفت ہونے کا ثبوت دے، وہ حق کی حمایت کرکے خدا کے خصوصی بندوں میں شامل ہو جائے۔ اس مزاج کے تحت جو کلچر بنتا ہے وہ دعوہ کلچر ہوتا ہے نہ کہ گن کلچر۔

بولنا، چپ رہنا

ایک بار ایک سینیر صحافی نے پبلک سکٹر کمپنیوں کے تعلقات عامہ کے افسروں سے پریس کے رول کے موضوع پر خطاب کیا۔ ان سے سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ بیرونی اخبارات میں ہندستان کے بارہ میں بہت کم خبریں شائع ہوتی ہیں۔ البتہ ہندستان کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو جن سے اس کی بدنامی ہوتی ہے، بہت اچھالا جاتا ہے۔

صحافی نے کہا کہ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس دنیا میں صرف طاقت ور لوگوں کو عزت اور نیک نامی ملتی ہے، ان لوگوں کو نہیں جو آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر پانچ جاپانیوں کا کوئی وفد کہیں جاتا ہے تو ملاقات کے وقت صرف ایک آدمی بولتا ہے۔ اور باقی افراد سر ہلا ہلا کر اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر پانچ ہندستانی افراد کہیں جاتے ہیں تو وفد کا سربراہ جب بولنا شروع کرتا ہے تو باقی چار افراد اس کو بیچ بیچ میں ٹوکتے ہیں، وہ اس کی تردید کرتے رہتے ہیں (چندر کانت سروانا، جنرل منیجر بی ایچ ای ایل، مستقبل، نئی دہلی)

بولنا بلاشبہ ایک ضروری کام ہے۔ مگر بہت سے لوگوں کو چپ ہونا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی ایک شخص کو موقع ملتا ہے کہ وہ بولے۔ جنھیں چپ رہنا ہے، اگر وہ چپ نہ ہوں تو جس کو بولنا ہے وہ بھی بولنے کا کام نہ کر سکے گا۔

کیا وجہ ہے کہ لوگ زیادہ بولتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ سوچے بغیر بولنا چاہتے ہیں۔ سوچنا ایک محنت ہے، آدمی محنت کرنا نہیں چاہتا، اس لیے وہ ایسا کرتا ہے کہ جو خیال دماغ میں آیا، فوراً اس کو زبان سے اگل دیا۔ آدمی اگر بولنے سے پہلے سوچے تو وہ بیش تر حالات میں بولنے سے رک جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بولنے سے زیادہ بڑا کام سننا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ لوگوں کا کلام سنے۔ اس پر غور کرے۔ اس کو اچھی طرح ہضم کرے۔ اس کے بعد جب ضرورت ہو تو بولے۔ بولنے والے کے لیے بھی بولنا اس وقت درست ہے جب کہ سننے والے لوگ سننے کے لیے تیار ہوں۔

بولنے والے کو چاہیے کہ اپنی بات کا مخاطب سب سے پہلے خود اپنے آپ کو بنائے۔ وہ اچھی طرح جانچے کہ جو بات وہ کہنے جا رہا ہے کیا واقعی وہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ اگر وہ کہنے کے قابل بات ہو تو کہے ورنہ چپ رہے۔

بولنے والے کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس کا بولنا کسی کی بات میں خلل ڈالنے کا سبب تو نہیں بن رہا ہے۔ اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے ذہن میں کوئی خیال رینگ گیا تو وہ فوراً ہی اس کو اگلنا شروع کر دیں گے۔ وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان کا خیال کیا اظہار کے قابل ہے یا نہیں۔

اظہار کے قابل بات کا بھی ہر حال میں اظہار کرنا ضروری نہیں۔ اگر ایک شخص بول رہا ہے اور آپ کا اظہار خیال اس کی بات میں صرف خلل ڈالنے کے ہم معنی بننے والا ہے تو ایسی حالت میں فرض کے درجہ میں ضروری ہو جاتا ہے کہ آدمی چپ رہے۔ ایسے موقع پر چپ رہنا ایک خدمت ہے اور بولنا محض خلل اندازی۔

درست اور مفید بولنا یہ ہے کہ آدمی بولنے سے پہلے چپ ہونے کی صلاحیت کا ثبوت دے۔ وہ دوسروں کو سنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو اپنی بات کا مخاطب بنائے۔

بولنے سے پہلے چپ ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی پہلے اپنی بات پر غور کرے۔ وہ اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا جائزہ لے۔ وہ اس سے متعلق ضروری معلومات حاصل کرے۔ اپنی بات پر یقین کر لینے سے پہلے وہ اپنی بات کی تحقیق کرے۔ وہ دوسروں کی سوچ اور اپنی سوچ میں تقابل کرے اور دیکھے کہ کیا واقعی اس کے پاس ایسے طاقت ور دلائل ہیں جو دوسروں کو مطمئن کر سکیں۔

بولنا برائے بولنا اس دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ بولنا وہی بولنا ہے جس سے کوئی واقعی مقصد پورا ہوتا ہو۔ اور ایسا بولنا کسی شخص کے لیے صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ ۱۰ منٹ بولنے کے لیے اس نے اس سے پہلے دس گھنٹہ اس پر غور کیا ہو۔

قول سدید

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیدا۔ یصلح لکم اعمالکم ویغفر لکم ذنوبکم ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیما (۳۳/۷۰-۷۱)

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

قرآن کی اس آیت میں اہل ایمان کو قول سدید کا حکم دیا گیا ہے۔ قول سدید کا مطلب ہے درست بات، ٹھیک بات۔ دوسرے لفظوں میں مطابق واقعہ بات۔ یعنی کوئی معاملہ جیسا ہے ٹھیک ویسا ہی اس کو بیان کرنا۔ بتایا گیا ہے کہ اگر تم نے قول سدید کا اہتمام کیا تو تمہارے اعمال درست ہو جائیں گے اور تم اللہ کی مدد سے کامیاب رہو گے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام معاملات بگڑے ہوئے ہیں۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں قول سدید کا اہتمام باقی نہیں رہا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان ایسے رہنما اٹھے جو یا تو شاعر تھے یا خطیب یا انشا پرداز، اور شاعر اور خطیب اور انشا پرداز کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ غیر سدید انداز میں کلام کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸) کو مسلمانوں کے درمیان "مفکر اسلام" کا درجہ حاصل ہے۔ موجودہ مسلمانوں پر غالباً سب سے زیادہ اثر اقبال کا ہوا ہے۔ اقبال بنیادی طور پر شاعر تھے۔ اس لیے ان کا بیشتر کلام قول غیر سدید کا نمونہ ہے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کے ذہن کو، قرآن کے الفاظ میں، غیر اصلاح یافتہ ذہن بنا دیا ہے۔ اور قرآن کے مطابق غیر اصلاح یافتہ ذہن کے لیے اس دنیا میں کامیابی نہیں۔

مثال کے طور پر اقبال کا ایک شعر ہے جو مسلمانوں کے درمیان بہت زیادہ مقبول ہوا ہے۔ اس میں وہ موجودہ مسلمانوں کے بارہ میں کہتے ہیں:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

یہ شعر سراسر سداد قول کے خلاف ہے۔ اس میں درست گفتاری کی صفت نہیں پائی جاتی۔ اور جس قول میں درست گفتاری کی صفت نہ ہو اس سے درست عمل کا ظہور کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت ابراہیم کے لیے آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ مگر وہ نبوت کا معاملہ تھا۔ وہ سادہ معنوں میں صرف ایمان کا معاملہ نہ تھا۔ پیغمبر کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ مدعو کے مقابلہ میں اس کی کامل حفاظت کی جائے تاکہ وہ ان کے اوپر اتمام حجت کی حد تک دعوت کا کام کر سکے۔ حضرت ابراہیم کے لیے آگ کا معاملہ اس سنت الٰہی سے تعلق رکھتا تھا۔ جب مخالفین نے آپ کو آگ میں پھینک دیا اور آگ آپ کے اوپر ٹھنڈی ہوگئی تو اس کا ٹھنڈا ہونا مذکورہ شعر کے مطابق "ایمان" کے زور پر نہ تھا بلکہ خدا کے مخصوص حکم کی بنا پر تھا۔ چنانچہ قرآن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراہیم۔

جس چیز کا تعلق خدا کے خصوصی حکم سے تھا اس کا تعلق اس شعر میں ایمان سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے ساری بات بدل گئی۔ اس معاملہ کا صحیح تصور آدمی کو خدا کی قدرت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جب کہ مذکورہ شاعرانہ تصور آدمی کے اندر جھوٹا بھرم پیدا کرکے اس کو بے معنی ٹکراؤ کی طرف لے جاتا ہے۔

اقبال نے حضرت ابراہیم کے معاملہ کو ایمان کا معاملہ بتا کر مسلمانوں کے اندر یہ ذہن بنایا کہ ایمان کو لے کر اگر تم آگ میں کود پڑو تو آگ تمہارے لیے گلزار ہو جائے گی۔ بھڑکتے ہوئے شعلے تمہارے ایمان کے زور پر ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔

اس غلط سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان آج بار بار "آگ" میں کود رہے ہیں۔ مزید یہ کہ جب آگ انھیں جلاتی ہے تو اپنے غلط ذہن کی بنا پر وہ دوبارہ اس کو دشمنوں کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کو انھیں اپنی اور اپنے رہنماؤں کی نادانی کے خانہ میں ڈالنا چاہیے۔ ایسے ہر تجربہ کو انھیں فریاد کا مسئلہ بنانے کے بجائے نصیحت کا مسئلہ بنانا چاہیے۔ فریاد سے جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور نصیحت سے اصلاح۔

بے اصل

یہود اپنے بارہ میں یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ پیغمبروں کی اولاد ہیں۔ جنت ان کے لیے لکھ دی گئی ہے۔ وہ تمام قوموں میں سب سے افضل ہیں۔ ان کا یہ حق ہے کہ وہ دوسروں کے اوپر حکومت کریں۔ یہ احساس ایک قسم کا مصنوعی غلاف بن کر ان کے ذہن پر چھا گیا۔ ان کی یہ فطری صلاحیت آخری حد تک بجھ گئی کہ وہ کسی حق کو بے لاگ طور پر دیکھیں اور کھلے ذہن کے تحت اس کا اعتراف کریں۔

یہی حال یہود کے بعد دوسری قوموں کا بھی ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ بعد کی قوم دوبارہ گراوٹ میں مبتلا ہو۔ اور اسی طرح فخر کی نفسیات کی شکار ہو جائے۔ وہ اپنے کو تمام قوموں سے برتر سمجھنے لگے۔ اس کا خیال یہ ہو جائے کہ اس کے لیے جنت میں داخلہ یقینی ہے۔ وہ اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ وہ تمام دنیا کے لوگوں پر حکمراں بنے۔

اس قسم کے احساسات انتہائی بے اصل ہیں۔ وہ انسانی فطرت سے آخری حد تک غیر مطابق ہیں۔ جو گروہ اس قسم کے احساسات میں جینے لگے اس کے دل و دماغ پر ایک مصنوعی پردہ پڑ جائے گا۔ اس کی فطری صلاحیتیں مرجھا جائیں گی۔ سنجیدگی اور اعتراف اور انصاف پسندی جیسے انسانی اوصاف اس سے چھن جائیں گے۔

فطرت تمام اعلیٰ انسانی اوصاف کی پہلی بنیاد ہے۔ فطرت کی زمین ہی پر ایمان کی اگلی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ فطرت کا زندہ ہونا استعداد کا زندہ ہونا ہے۔ اور جن لوگوں کے اندر استعداد زندہ ہو وہی حقائق ایمانی کا اعتراف کریں گے، وہی اپنے آپ پر عمل کر کے حیاتِ ربانی کی تعمیر کریں گے۔

اس کے برعکس جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ مصنوعی خیالات ان کی فطرت پر چھا جائیں، وہ صحت فکر اور اعتراف حق سے محروم ہو جائیں گے۔ اور جو لوگ صحت فکر اور اعتراف حق سے محروم ہو جائیں ان کو امتحان کی اس دنیا میں کبھی سچائی کا راستہ ملنے والا نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ بھٹکتے رہیں، یہاں تک کہ ابدی بربادی کے گڑھے میں جا گریں۔

دو قسم کے انسان

ایک ہے دلیل سے چپ ہونا، دوسرا ہے طاقت سے چپ ہونا۔ موجودہ دنیا دلیل سے چپ ہونے کا امتحان ہے۔ آخرت وہ دنیا ہے جہاں طاقت کا ظہور آدمی کو چپ کر دے گا۔ مگر دونوں یکساں نہیں۔ دلیل سے چپ ہونے والے آدمی کا نام حق کا اعتراف کرنے والوں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ اور جو لوگ طاقت کے ذریعہ چپ ہوں، ان کا چپ ہونا صرف یہ ثابت کرے گا کہ وہ مجرم تھے۔ وہ دلیل کے آگے نہیں جھکے۔ وہ صرف اس وقت جھکے جب کہ وہ جھکنے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔

وہب بن منبہ تقدیر کے قائل تھے۔ کسی مخالف نے جھوٹا قصہ بنا کر ان کے بارہ میں مشہور کر دیا کہ وہ تو کہتے ہیں کہ قوم لوط اپنے اعمال بد کی جواب دہ نہیں، کیوں کہ یہ تو خود خدا تھا جس نے قوم لوط کے افراد کو ایک دوسرے کے اوپر سوار کیا۔ طاؤس کو یہ خبر پہنچی تو وہ وہب بن منبہ سے ملے اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ وہب بن منبہ نے اس کو سن کر کہا : اعوذ باللہ۔ اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے اور بات ختم ہو گئی (اسلامی زندگی ۸۰)

راقم الحروف کی ملاقات ۱۹۶۶ میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے ہوئی۔ ان کا نام ڈاکٹر سمیع اللہ خاں تھا۔ وہ ملحد تھے مگر نہایت سنجیدہ مزاج آدمی تھے۔ مذہب پر گفتگو کے دوران انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ خدا کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کرائٹیرین (criterion) کیا ہے۔ میں نے جواب میں کہا : وہی کرائٹیرین جو آپ کے پاس کوئی چیز ثابت کرنے کے لیے ہو۔ اس کے بعد نہ انھوں نے کچھ کہا اور نہ میں نے۔ بس انھیں دو جملوں پر بات ختم ہو گئی۔

مذکورہ واقعات میں طاؤس دلیل نقلی کے زور پر چپ ہوئے تھے اور ڈاکٹر سمیع اللہ خاں دلیل عقلی کے زور پر چپ ہو گئے۔ اسی کا نام اعتراف ہے، اور اعتراف بلاشبہ موجودہ امتحان کی دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔

جو لوگ نہ نقلی دلیل پر چپ ہوں اور نہ عقلی دلیل پر، وہ حیوان کی مانند ہیں۔ وہ اس نعمت سے ہمیشہ محروم رہیں گے جس کو اعتراف کہا جاتا ہے۔

بمبئی کا سفر

۱۲ جنوری ۱۹۹۳ کو میں ایک پروگرام کے تحت ودیشا (مدھیہ پردیش) میں تھا۔ یہاں اتفاقی طور پر مسٹر مدھو مہتا سے ملاقات ہوئی۔ موصوف مشہور ہندستانی اندولن کے چیرمین ہیں جس کا ہیڈ کوارٹر بمبئی (Tel. 3624471) میں ہے۔ موصوف سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان سے موجودہ ملکی حالات پر گفت گو ہوئی تو وہ میرے خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ دہلی واپس جانے کے بعد ان کے کئی ٹیلیفون آئے۔ وہ بمبئی میں میرا کچھ پروگرام رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے اصرار پر بمبئی کا سفر ہوا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کی صبح کو بمبئی کے لئے روانگی ہوئی، اور ۵ فروری کی شام کو دہلی واپس آگیا۔

دہلی ایر پورٹ پہنچا تو وہ بھیانک ہوائی حادثہ یاد آیا جو تین ہفتہ پہلے ۹ جنوری کو یہاں پیش آیا تھا۔ روسی ساخت کا ایک جہاز (Tu-154) جو کہ انڈین ایرلائنز کے استعمال میں تھا، حیدرآباد سے اڑکر دہلی پہنچا۔ اس وقت ہوائی اڈہ پر کچھ کہر تھی۔ جہاز نیچے اترا تو پائلٹ جہاز کو رن وے کی سنٹر لائن پر نہ اتار سکا۔ جہاز کا دائیں طرف کا پہیہ پختہ رن وے سے اتر کر کچی زمین پر چلا گیا۔ اس کے نتیجے میں جہاز ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ تاہم اس کے ۱۶۳ مسافر معجزاتی طور پر بچ گئے۔

زندگی کی بھی ایک پختہ سڑک ہے۔ اور اس کے دائیں اور بائیں کچے راستے ہیں۔ سڑک کے سفر کا اصول ہے کہ احتیاط کے ساتھ چلو (drive cautiously) یہی اصول زندگی کے عام سفر کا بھی ہے۔ حقائق کی رعایت کر کے زندگی کا سفر طے کرنا گویا پختہ سڑک پر چلنا ہے۔ اور جذباتی ابال یا خوش گمانی کے تحت بلا احتیاط اپنی گاڑی چلانا گویا کچی زمین پر اپنی گاڑی کو دوڑانا ہے۔ ایک صورت میں زندگی کی گاڑی محفوظ سفر کر کے اپنی منزل تک پہنچے گی اور دوسری صورت میں صرف یہ ہوگا کہ وہ بربادی کے گڑھے میں گر کر تباہ ہو جائے۔

دہلی سے بمبئی کے لئے انڈین ایرلائنز کے جہاز کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ آج کے اخبارات دیکھے۔ مگر کوئی بات ایسی نہیں ملی جس کو میں یہاں درج کر سکوں۔ آجکل کے اخباروں

کا یہ حال ہے کہ ان میں زیادہ تر ایسی خبریں اور ایسے مضامین ہوتے ہیں جن میں کوئی سبق نہ ہو۔ یہ گویا کہ نمک کے پہاڑ ہیں جن میں شکر کے کچھ ذرات مل جاتے ہیں جن کو ڈھونڈ کر نکالنا پڑتا ہے۔ انگریزی شاعر کے الفاظ ہیں " پانی پانی ہر طرف، مگر پینے کے لئے ایک قطرہ نہیں :

Water, water everywhere. Nor a drop to drink.

جہاز میں ایک ہندو سائنٹسٹ سے ملاقات ہوئی۔ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ وہیں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ پھر انھیں خیال آیا کہ اپنے دیش جائیں اور وہاں سائنسی علوم کو ترقی دیں۔ مگر یہاں آنے کے بعد انھیں بہت تلخ تجربہ ہوا۔ انھوں نے پایا کہ یہاں کے تمام سائنس داں کیریسٹ سائنس داں (careerist scientists) ہیں۔ وہ اپنے سوا کسی کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے حوصلہ شکن تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ اب میں دوبارہ امریکہ چلا جاؤں گا۔ کیوں کہ انڈیا میں میرا کوئی مستقبل نہیں :

I will go back to the States, as there would hardly be any future for me in India.

جس ملک میں خود اس ملک کے اپنے دماغ مایوس ہو جائیں، وہ ملک گویا کہ خود اپنے معماروں سے محروم ہو گیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔

ایک وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ عدالت میں جب جج کے سامنے مقدمہ پیش ہوتا ہے تو ایک طرف ہم ہوتے ہیں اور دوسری طرف ہمارا مخالف وکیل۔ اس وقت ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم ایسی بات کہیں جس سے ہمارا مخالف مشتعل ہو جائے۔ اگر کسی طرح ہم نے اس کو مشتعل کر دیا تو اس کے بعد ہماری کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مشتعل آدمی کا ذہن ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ غیر متاثر ذہن کے تحت معاملہ کے تمام پہلوؤں پر دھیان دے سکے۔ اس کا ذہن اصل معاملہ سے ہٹ کر حریف کی شخصیت کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر متعلق باتیں کرنے لگتا ہے۔ متعلق باتیں اس کی پکڑ سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو جائے

وہ کبھی مقابلہ کے میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا کہ اسی کا نام صبر ہے۔ ایک ہے عاجلانہ فکر، دوسری ہے صابرانہ فکر۔ عاجلانہ فکر وہ ہے جب کہ آدمی ردعمل میں مبتلا ہو کر سوچے۔ صابرانہ فکر یہ ہے کہ آدمی فریق ثانی کی اشتعال انگیزی سے غیر متاثر رہے۔ وہ آزادانہ سوچ کر اپنے عمل کا رخ متعین کرے۔

آج ۳۱ جنوری کو بمبئی ایرپورٹ پر ایک حادثہ پیش آیا۔ برٹش ایرویز کا ایک جہاز (Boeing 747) بمبئی سے لندن کے لئے روانہ ہوا۔ مگر ایک گھنٹہ کے اندر دوبارہ وہ بمبئی واپس آگیا۔ اس کے اوپر عملہ کے ۱۸ لوگوں کو ملا کر کل ۳۲۷ عورت اور مرد سوار تھے۔ واپسی کی وجہ یہ ہوئی کہ فضا میں بلند ہونے کے بعد جہاز کے پائلٹ نے پایا کہ اس کا ایک انجن جنریٹر (engine generator) فیل ہو گیا ہے۔ اب جہاز کو آگے لے جانا اس کو منزل کی طرف لے جانا نہیں تھا بلکہ اس کو تباہی کی طرف لے جانا تھا، اس لئے پائلٹ نے پیچھے کی طرف واپسی کا فیصلہ کیا۔

آگے بڑھنا بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس دنیا میں کبھی پیش قدمی کو روک کر پیچھے کی طرف واپس جانا آدمی کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی کمیوں کو درست کر کے دوبارہ پیش قدمی کے قابل ہو سکے۔ جب کہ اس وقت آگے بڑھنے کا مطلب عملی طور پر یہ بن جاتا ہے کہ اپنے وجود ہی کا خاتمہ کر لیا جائے۔

بمبئی ایرپورٹ پر یہاں کے کئی احباب موجود تھے۔ ان کے ساتھ شہر کے لئے روانگی ہوئی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کو فجر کی نماز میں نے نظام الدین کی کالی مسجد میں پڑھی تھی۔ اور اسی دن ظہر کی نماز کے وقت میں بمبئی پہنچ چکا تھا۔ جب کہ دہلی اور بمبئی کے درمیان تقریباً ۱۵۵۰ کیلو میٹر کا فاصلہ ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک واقعہ وہ گزرا جس کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے ——— پاک ہے وہ اللہ جو ایک رات اپنے بندے کو مکہ کی مسجد حرام سے دور کی مسجد (فلسطین) تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ (الاسراء)

"اسراء" کے اس معاملہ پر سوچتے ہوئے خیال آیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعہ کا شاید ایک پہلو یہ بھی ہو کہ تاریخ میں آپ ایک ایسے

انقلاب کا آغاز کرنے والے ہیں جب کہ انسان کے لئے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ "ایک رات" میں دور کی کسی منزل کا سفر کرے اور پھر اسی رات کو دوبارہ اپنے مقام پر واپس آجائے۔

بمبئی میں میرا قیام ریجنسی ہوٹل کے کمرہ نمبر ۳۰۵ میں تھا۔ یہ بمبئی کے ایک پرسکون علاقہ (نیپین سی روڈ) پر واقع ہے۔ اس لحاظ سے وہ میری پسند کے مطابق تھا۔

بمبئی ہندستان کا سب سے بڑا شہر ہے، بمبئی کے ساتھ بے شمار یادیں اور تاریخیں وابستہ ہیں۔ جون ۱۸۸۸ میں موہن داس کرم چند گاندھی یہیں کے ساحل سے مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال تھی۔ انھوں نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر پانی کے جہاز کا ٹکٹ حاصل کیا تھا۔ بنیا کمیونٹی کو معلوم ہوا تو اس نے موہن داس کو ذات باہر (outcaste) قرار دیا۔ لوئی فشر کے الفاظ میں، ان کا مذہب سمندری سفر طے کر کے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ کیوں کہ وہاں ہندو دھرم پر عمل نہیں کیا جا سکتا تھا:

Their religion forbade voyages abroad because Hinduism could not be practiced there. (p.23)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب سے سو سال پہلے تک انڈیا کا سماج کتنا بند سماج تھا۔ اس بند سماج کو ۵۰ فیصد مسلم تہذیب نے کھولا، اور بقیہ ۵۰ فیصد مغربی تہذیب نے۔

بمبئی فساد کے زمانہ میں پاکستانی اخبارات میں صفحہ اول پر نہایت اشتعال انگیز خبریں چھپ رہی تھیں۔ روزنامہ وفاق جو پاکستان کا اسلامی اخبار سمجھا جاتا ہے، اس کے شمارہ ۱۳ جنوری ۱۹۹۳ کے صفحہ اول کی ایک خبر کا عنوان یہ تھا:

بمبئی فسادات کا جہنم بن گیا۔ شہر پر جنونی ہندوؤں اور غنڈوں کا راج

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت اس قسم کے اخبارات ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اخبارات زرد صحافت کی بدترین مثال ہیں۔ ان اخبارات نے کوئی بھی تعمیری کردار ادا نہیں کیا۔ انھوں نے پچھلے سو سال میں صرف ایک کام کیا ہے۔ مسلمانوں کے مزاج کو بگاڑنا۔ انھیں آخری حد تک دوسری قوموں سے متنفر کر دینا۔ اسی منفی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان چھوٹی چھوٹی باتوں پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ جب کہ اس دنیا

میں ترقی کا راز برداشت ہے نہ کہ اشتعال۔

۳۱ جنوری کی شام کو مسٹر مدھو مہتا کے مکان پر ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ اس دوران انھوں نے کئی دلچسپ باتیں سنائیں۔ سردار پٹیل کے سکریٹری نے ایک بار انھیں بتایا کہ ۱۹۴۷ میں جب پاکستان سے ریفیوجی بڑی تعداد میں دہلی آئے تو وہ چاندنی چوک کے علاقہ میں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے اور وہاں سامان رکھ کر بیچنے لگے۔ اس کے بعد چاندنی چوک کے دکانداروں کا ایک وفد سردار پٹیل سے ملا جو اس وقت ہوم منسٹر تھے۔ انھوں نے شکایت کی کہ ان شرنارتھیوں نے جب سے آکر فٹ پاتھ پر کاروبار شروع کیا ہے، ہمارا بزنس ختم ہوگیا ہے۔ اس لئے ان شرنارتھیوں کو یہاں سے ہٹائیے۔

سردار پٹیل ان تاجروں کی بات چپ چاپ سنتے رہے۔ جب انھوں نے اپنی بات ختم کی تو سردار پٹیل نے پرسکون لہجہ میں کہا: اس کا حل بہت آسان ہے۔ آپ لوگ دکان چھوڑ کر فٹ پاتھ پر آجائیے اور فٹ پاتھ والوں کو دکان میں بٹھا دیجئے۔ اس کے بعد تمام دکاندار خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے ——— سردار پٹیل کا یہ جواب بتاتا ہے کہ ایڈمنسٹریشن چلانے کے لئے کس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسٹر مدھو مہتا نے بتایا کہ ۱۹۴۶ میں جب پنجاب اور بنگال میں فرقہ وارانہ فساد ہو رہا تھا۔ پولیس اور فوج اس کو کنٹرول کرنے سے عاجز ہو گئی تھی۔ اس وقت گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن برلا ہاؤس، دہلی گئے اور مہاتما گاندھی سے ملے۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ ملک میں آگ لگی ہوئی ہے، اور میری فورس اس کو روکنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہی اس کو روک سکتے ہیں۔ آپ میری واحد نفری فوج ہیں:

You are my one-man army.

بمبئی میں ایک انگریزی جرنلسٹ مسٹر الوین فرنینڈیز (Allwyn Fernandes) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ بمبئی کے لوگ مسٹر مدھو مہتا کے بارہ میں کہتے ہیں کہ وہ غیر مقبول کاموں کے چیمپئن ہیں:

Madhu Mehta is the champion of unpopular causes.

مسٹر مدھو ہتا کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ ایک با اصول آدمی ہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اصول کی خاطر کرتے ہیں نہ کہ مفاد کی خاطر۔ لوگ عام طور پر ان اشوز کو لے کر اٹھتے ہیں جو عوام پسند ہوں، جن کے ذریعہ فوراً مقبولیت حاصل ہوتی ہو۔ مگر مدھو ہتا صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کیا صحیح ہے۔ اس دنیا میں مفاد کو نظر انداز کرنے والا آدمی مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ مدھو ہتا ایسے ہی ایک نادر آدمی ہیں، اسی لئے ان کے بارہ میں کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ غیر مقبول مقاصد کے چیمپئن ہیں۔

اخباروں میں یہ بات آچکی ہے کہ عین اس زمانہ میں جب کہ بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد ہو رہا تھا، اس کے پڑوسی علاقہ بھیونڈی میں فساد نہیں ہوا۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ علمی مطالعہ حقیقۃً تقابلی مطالعہ کا دوسرا نام ہے۔ اس معاملہ میں علمی مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ بمبئی میں فساد ہوا تو بھیونڈی میں فساد کیوں نہیں ہوا۔ نارتھ انڈیا میں فساد ہوتا ہے تو ساؤتھ انڈیا میں فساد کیوں نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ دنیا بھر کے لاکھوں مسلمان اس دشمن ملک میں امن وسکون کے ساتھ کس طرح رہتے ہیں۔

اگر اس طرح تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس سے ہم کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جہاں فساد ہوتا ہے اس کا سبب کیا ہے، اور جہاں مسلمانوں کو امن وسکون کے ساتھ رہنے کا موقع مل رہا ہے وہاں ایسا کس طرح ہوتا ہے۔

میں نے اس پہلو سے بہت غور کیا ہے۔ میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں مسلمان حقیقت پسندانہ انداز میں رہتے ہیں وہاں فساد نہیں ہوتا ہے اور جہاں جذباتی انداز میں رہتے ہیں وہاں فساد ہو جاتا ہے۔ فسادی عناصر تو ہر جگہ موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کا مثبت ردعمل ایک جگہ بم کو ڈیفیوز کر دیتا ہے۔ اور مسلمانوں کا منفی ردعمل دوسری جگہ بم کو انفجار تک پہنچا دیتا ہے۔

بہار کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے موجودہ انتظامی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک دلچسپ قصہ بتایا۔ بہار کی ایک سڑک پر کچھ ڈاکوؤں نے ایک مسافر بس کو روکا۔ وہ گن لئے ہوئے بس میں داخل ہوئے اور تمام مسافروں کو حکم دیا کہ جس کے پاس جتنی رقم ہو وہ سب ہمارے حوالے کر دے۔ مسافروں کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی رقم

ڈاکوؤں کے حوالے کردی۔

آخر میں ڈاکوؤں کے سردار نے حاصل شدہ رقم کو گنا تو وہ کل سات ہزار تھی۔ اس نے کہا کہ اس میں تو ہم کو گھاٹا ہو جائے گا۔ کیوں کہ ہمیں دس ہزار روپیہ تو پولیس کو دینا ہے۔ چنانچہ اس نے تمام کی تمام رقم مسافروں کو دوبارہ واپس کردی۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کی شام کو ۵ بجے گورنر ہاؤس میں مہاراشٹر کے گورنر پی سی الکزینڈر (P.C. Alexander) سے ملاقات ہوئی۔ اس میں میرے علاوہ اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند، مدھو مہتا، جسٹس دھرم ادھیکاری، انا ہزارے اور دوسرے کئی لوگ شریک تھے۔ گورنر صاحب نے کہا کہ انھوں نے میرے کچھ انگریزی مضامین پڑھے ہیں اور شانتی یاترا کا ٹیپ دیکھا ہے۔ اس سے وہ کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ملک میں جو سنگین مسئلہ ہے اس کو پولیٹکل لوگ حل نہیں کر سکتے۔ اس کو صرف مذہبی اور روحانی شخصیتیں ہی حل کر سکتی ہیں۔

اس ملاقات کی رپورٹ راج بھون پریس ریلیز کے تحت بمبئی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (یکم فروری ۱۹۹۳) میں چھپی۔ اس میں یہ صراحت بھی تھی کہ یہ ملاقات خود گورنر کی درخواست پر ہوئی:

Various religious leaders and prominent citizens met the governor at Raj Bhavan at his request. (p.3)

یکم فروری کی شام کو مسٹر مدھو مہتا کی قیام گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ بمبئی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے خطاب کیا۔ خطاب کے دوران میں نے کہا کہ لوگ اجودھیا کو پرابلم بنائے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اجودھیا کو سبق اور نصیحت کا واقعہ بنا دیا جائے۔

یہاں سوال و جواب بھی ہوئے۔ ایک نوجوان راہل شرما (Rahul Sharma) نے کہا کہ مسلمان اپنے آپ کو پاکستان کے ساتھ آئیڈنٹیفائی کرتے ہیں۔ اس کے بارہ میں آپ کا خیال کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میری معلومات کے مطابق یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہاں شاید کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں جو اپنے آپ کو پاکستان کے ساتھ آئیڈنٹیفائی کرتا ہو۔ دونوں ملکوں کے درمیان کرکٹ میچ میں کچھ مسلمان لڑکے بعض طفلانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ میں اس قسم کی حرکتوں کو لغو سمجھتا ہوں۔ مگر وہ صرف

اس قابل ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان کی بنیاد پر ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں رائے بنانا صحیح نہیں۔

ٹائمس آف انڈیا کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر ایلون فرنانڈیز (Allwyn Fernandes) نے مفصل انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ریجنسی ہوٹل کے کمرہ ۳۰۵ میں ریکارڈ کیا گیا۔ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲ فروری ۱۹۹۳ میں یہ انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔

سوالات زیادہ تر مسلمانوں کے مسائل کے بارہ میں تھے۔ میں نے ایک بات یہ کہی کہ ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک بات واضح طور پر جان لینا چاہئے کہ جب مختلف لوگ مل کر ایک سماج میں رہتے ہیں تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ایک کو دوسرے سے کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ اور وہ ہر سماج میں ہوتا ہے خواہ وہ انڈیا کا معاملہ ہو یا اور کسی ملک کا معاملہ۔

ایسی حالت میں کیا کرنا ہے۔ ایسی حالت میں کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو اوانڈ کریں۔

جنرل ایس کے سنہا (۶۶ سال) پٹنہ کے رہنے والے ہیں۔ ان سے یہاں ملاقات ہوئی۔ ۲ فروری کی ملاقات میں میں نے کہا کہ آپ لمبی مدت تک فوج میں رہے ہیں۔ اپنی فوجی زندگی کا کوئی واقعہ بتائیے۔

انھوں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزوں کے زمانہ میں جو فوج تھی وہ آج سے بہت مختلف تھی۔ اس میں زبردست کیرکٹر پایا جاتا تھا۔ ۱۹۰۴ میں لارڈ کرزن وائسرائے تھے۔ کلکتہ میں انگریزوں کی ایک بٹالین تھی۔ اس میں ایک ہزار انگریز سپاہی تھے۔ ان میں سے کچھ انگریز کلکتہ کی ایک کینٹین میں کھانا کھانے کے لئے گئے۔ ہندستانی ملازم نے کھانا لانے میں کچھ دیر کی۔ ایک انگریز سپاہی جو شراب پئے ہوئے تھا غصہ میں آگیا۔ اس نے ہندستانی ملازم کو گھونسا مار دیا۔ اتفاق سے وہ مر گیا۔ یہ واقعہ اخبار میں چھپ کر کافی مشہور ہوا۔

اس کے بعد یہ کیس فوج کی کورٹ آف انکوائری میں آیا۔ انگریز فوجیوں نے طے کیا کہ وہ گواہی نہیں دیں گے اور یہ کہہ دیں گے کہ ہم کو نہیں معلوم کہ کس نے گھونسا مارا۔ آخر کار قاتل کا ثبوت نہ مل سکا۔ فوجی ذمہ داروں نے وائسرائے کو لکھ کر بھیج دیا کہ قاتل کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔

اس لئے اس کیس کو کلوز کر دیا جائے اور مقتول کے وارثوں کو پانچ ہزار روپیہ بطور تلافی دے دیا جائے'۔

لارڈ کرزن نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ مقتول کو پانچ ہزار روپیہ ہم دے دیتے ہیں۔ مگر کیس کو ہم کلوز نہیں کریں گے۔ بلکہ پوری انگریز بٹالین کو اس کی سزا دیں گے۔ چنانچہ وائسرائے نے ایک ہزار فوجیوں کی اس انگریز بٹالین کو برما کے ایک غیر ترقی یافتہ علاقہ میں بھیج دیا جو کہ ملیریا کا علاقہ تھا۔ وہاں پوری بٹالین دو سال تک بطور سزا رہی۔ بہت سے لوگ ملیریا کی وجہ سے بیمار ہو گئے اور ستر انگریز فوجی وہیں مر گئے۔

ڈاکٹر عبد الکریم نائک بہت باشعور اور دردمند آدمی ہیں۔ وہ اپنے دو صاحبزادوں، ڈاکٹر محمد نائک اور ڈاکٹر ذاکر نائک کے ساتھ نہایت مفید انداز میں "دعوہ ورک" کر رہے ہیں۔

یکم فروری کی شام کو مدھو مہتا صاحب کی رہائش گاہ پر جو میٹنگ ہوئی، اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہاں اجتماع کے بعد ان لوگوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دوسری انگریزی کتابیں لوگوں کے درمیان تقسیم کیں۔ لوگوں نے بہت شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

ڈاکٹر نائک صاحب نے کہا کہ مسلم نوجوان اکثر شکایت کرتے ہیں کہ ان کے لئے مواقع نہیں۔ جو مواقع بظاہر مہیا نہیں ہیں ان کی تو وہ شکایت کرتے ہیں۔ مگر جو مواقع مہیا ہیں ان کو وہ استعمال نہیں کرتے۔

انھوں نے کہا کہ ایک چیز یہ ہے کہ آدمی ڈسپلن والی زندگی اختیار کرے۔ اس سلسلہ میں ایک ضروری کام یہ ہے کہ ہر آدمی ڈائری رکھے اور روزانہ اپنی سرگرمیوں کا اس میں اندراج کرے۔ اسی طرح ملک میں بہت سے رضاکارانہ ادارے (volunteers bodies) ہیں جو مفت میں مختلف قسم کی چیزیں سکھاتے ہیں۔ مثلاً جرنلزم، اسمال اسکیل انڈسٹری، جمنازیم اسکاوٹنگ۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی رضاکار تنظیموں سے وابستہ ہو کر مسلم نوجوانوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

۲ فروری کی دوپہر کو مہاراشٹر اسٹیٹ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک تاریخی بلڈنگ میں قائم ہے۔ یہاں انسپکٹر جنرل آف پولیس مسٹر جی این اوبالے (G.N. Ubale)

اور ڈپٹی کمشنر آر ایس راٹھور (R.S. Rathod) اور دوسرے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

عام طور پر لوگ پولیس کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ پولیس کے لوگ بھی دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ اس کو چھیڑیں تو وہ غصہ میں آجاتا ہے۔ حتی کہ مقدس بزرگ بھی۔ جب آدمی کسی کے اوپر غصہ ہوتا ہے تو وہ اس کے خلاف ہر کارروائی کر گزرتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔ جس آدمی کے پاس کنکر ہے وہ کنکر پھینک کر مارے گا۔ اور اگر بندوق ہے تو وہ بندوق چلائے گا۔ گویا کہ یہ معاملہ وہ ہے جس کی بابت فارسی شاعر نے کہا کہ:

ایں گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند۔

مسٹر آر ایس راٹھور بمبئی پولیس میں ڈپٹی کمشنر ہیں۔ ان کی فرمائش پر ۲ فروری کی شام کو ان کے یہاں کھانا کھایا۔ کھانا، فرنیچر، مکان، ہر چیز میں سادگی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ صرف تنخواہ پر گزارہ کرتے ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ عام پولیس افسروں سے بہت مختلف ہیں۔

کھانے کے دوران انھوں نے کئی قصے بتائے۔ ایک یہ تھا کہ ۱۹۷۷ میں جب جنتا گورنمنٹ نے اندرا گاندھی کو گرفتار کیا، اس وقت وہ پربھنی میں پولیس افسر تھے۔ اس وقت شہر میں دو جلوس نکلے۔ ایک کانگرس پارٹی کا جو حکومت کے خلاف بطور احتجاج تھا۔ دوسرا جنتا پارٹی کا جو حکومت کی حمایت میں تھا۔ دونوں ایک ہی سڑک پر مخالف سمتوں سے آرہے تھے۔ اس سے ظاہر تھا کہ ایک پوائنٹ پر پہنچ کر دونوں میں ٹکراؤ ضروری ہے۔

دونوں طرف ہزاروں آدمی تھے اور دونوں ہی جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ مسٹر راٹھور وردی میں ملبوس ہو کر موقع پر پہنچے۔ انھوں نے جلوس کا مائک اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تقریر شروع کی۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس یہاں کافی فورس موجود ہے۔ اگر آپ لوگ تشدد کرتے ہیں تو میں بھی تشدد کروں گا اور فوراً فائرنگ کا آرڈر دے دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ جلوس میں بہت سے معصوم (innocent) لوگ ہیں۔ اگر فائرنگ ہوئی تو سب سے پہلے ہی معصوم لوگ مریں گے۔ اس لئے میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ اگر وہ اپنی جان بچانا چاہتے ہیں تو فوراً یہاں سے چلے جائیں۔

اس اعلان کے بعد آدھے سے زیادہ لوگ جلوس سے نکل کر چلے گئے۔ اس کے بعد جلوس

والے اتنا پریشان ہوئے کہ انھوں نے راستہ بدل دیا اور کسی ٹکراؤ یا ایکشن کی نوبت نہیں آئی۔

۲ فروری کو مسٹر مدھو مہتا کی رہائش گاہ پر جنرل سنہا اور راما کرشنن (S. Ramakrishan) سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر راما کرشنن نے میری کل کی تقریر کے بارہ میں کہا کہ اس کو سن کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی رشی بول رہا ہے۔ آپ کے شبد ہونٹوں سے نہیں بلکہ دل سے نکل رہے تھے۔

مسٹر راما کرشنن ایک بہت بڑا مشن چلا رہے ہیں۔ اس کا نام ڈی ڈیوائن لائف سوسائٹی ہے۔ انھوں نے اپنی سوسائٹی کی چھپی ہوئی کئی کتابیں دیں جو اخلاق اور روحانیت کی تعلیمات پر مبنی تھیں۔ انھوں نے راج گوپال اچاری کے کئی واقعات بتائے۔

راج گوپال اچاری کے متعلق میرا خیال ہے کہ مہاتما گاندھی کے بعد وہ پورے ملک میں سب سے زیادہ قابل اور لائق آدمی تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد اگر وہ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم ہوتے تو شاید ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

مسٹر پرتاپ بھوگی لال بمبئی کے ایک صنعت کار ہیں (فون نمبر 3623688) ان کی رہائش گاہ پر ۲ فروری کی شام کو مغرب بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تقریباً چالیس لوگ شریک ہوئے۔ وہ زیادہ تر ممتاز تجارتی افراد تھے۔ اس موقع پر میں نے سہ نکاتی فارمولے کی وضاحت کی نیز یہ بتایا کہ موجودہ ملکی مسائل کا حل کیا ہے۔ آخر میں سوال وجواب ہوا۔

۲ فروری کو مسٹر اشیش شاہ (Ashish Shah) نے نہایت تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو مڈ ڈے (Mid-day) کے لئے تھا۔ وہ مڈ ڈے کے شمارہ ۳ مئی ۱۹۹۳ میں شائع ہو چکا ہے۔

مسٹر ہرندر دوے ایک گجراتی اخبار جنم بھومی (جاری شدہ ۱۹۳۴) کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے تفصیلی انٹرویو لیا۔ وہ اشعار کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے موجودہ ملکی لیڈر شپ پر سلام مچھلی شہری کا ایک شعر سنایا:

سمندر تیز طوفانی ہوا ٹوٹی ہوئی کشتی
یہی اسباب کیا کم تھے کہ اس پر ناخدا تم ہو

مسٹر ہرندر دوے روحانی مزاج کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں پرارتھنا بھی کرتا ہوں تو بھگوان سے یہ کہتا ہوں کہ جو بھی اچھی بات میرے لئے ہو اس کو آپ میرے لئے کر دو۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ سوامی ویویکانند کے بہت معتقد تھے۔ انھوں نے سوامی ویویکانند کے عالمی مذہب (universal religion) کے نظریہ کی حمایت کی۔ انھوں نے ایک کتاب دکھائی۔ اس میں تھا کہ سوامی ویویکانند نے ۱۸۹۳ میں امریکہ کے ایک لکچر میں کہا تھا کہ نام نہاد ٹالرنس ایک بددینی کی بات ہے۔ میں ٹالریٹ کرنے کے بجائے قبول کرنے میں یقین رکھتا ہوں۔ ٹالرنس کا مطلب یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تم غلط ہو اور میں تم کو صرف زندہ رہنے کی اجازت دیتا ہوں۔ کیا یہ سوچنا بددینی نہیں ہے کہ میں اور تم دونوں ایک دوسرے کو بس زندہ رہنے کا حق دے رہے ہوں۔ میں سارے ہی مذہبوں کو قبول کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ یہ ایک خوبصورت تخیل تو ہے مگر وہ کوئی خوبصورت نظریہ نہیں۔ نظریہ وہ ہے جو قابل عمل ہو۔ یہ بات موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں۔ یہاں عملی طور پر جو چیز ممکن ہے وہ ٹالرنس ہی ہے۔ اس کے ناقابل عمل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس نظریہ کے ماننے والے ایسے مذہب کی تو قدر کرتے ہیں جو انھیں کی طرح یہ کہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ مگر جو مذہب یہ کہے کہ سچا مذہب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اس کی قدر دانی کرنے کے لئے یہ لوگ کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ حالانکہ اپنے نظریہ کے مطابق انھیں ایسے مذہب کی بھی پوری قدر کرنا چاہئے۔

تعدد حقیقت کے اس ہندو نظریہ کو مغربی ملکوں میں بہت مقبولیت ملی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے توحید حقیقت کے نظریہ کو وہاں زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اس کو مغرب کے لوگوں کا تعصب قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اسلام دشمنی کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ رائے درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اہل مغرب کے لئے ہندوازم کا نظریہ زیادہ مفید مطلب (convenient) ہے، جب کہ اسلام کا نظریہ انھیں اپنے لئے موافق نظر نہیں آتا۔

اہل مغرب یہ چاہتے ہیں کہ مذہب ان کے سیاسی اور تمدنی معاملات میں داخل نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے کہا کہ مذہب ایک پرائیویٹ انسانی معاملہ ہے۔ ہندوازم کے نظریہ میں بھی ان کو یہی فائدہ دکھائی دے رہا ہے۔ جس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے مذہب

کو ایک پرائیویٹ معاملہ بتایا تھا وہی مقصد انھیں ہندوازم کے اس نظریہ میں بھی الفاظ بدل کر حاصل ہو رہا ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ عربی، اردو، فارسی، انگریزی میں مسلمانوں کے جتنے بھی اخبار یا رسالے نکلتے ہیں، ان سب کو ایک ہی مشترک نام دیا جاسکتا ہے، اور وہ پروٹسٹ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہر صحافت نامہ احتجاج نامہ ہے۔ ان میں اغیار کو مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار بتا کر ان پر سب وشتم کیا جاتا ہے۔

یہ یقینی طور پر قرآن کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تمہارے اوپر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ صرف تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانا عملی طور پر قرآن کے انکار کے ہم معنی ہے۔ مگر قرآن کا یہ عملی انکار ساری مسلم دنیا میں علی الاعلان کیا جارہا ہے۔ اور یہ عملی انکار وہ لوگ کر رہے ہیں جو قرآن اور اسلام کے نام ہی پر اپنی ساری مہم چلا رہے ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ پر بات کرتے ہوئے کہا کہ دستور نے ہم کو برابری کا حق دیا ہے اور کوئی بھی شخص ہم کو اپنا دستوری حق لینے سے روک نہیں سکتا۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا :

None can curtail minorities rights bestowed by the constitution.

میں نے کہا کہ یہ واقعہ تو خود آپ لوگوں کے بیان کے مطابق، پچھلے چالیس سال سے جاری ہے کہ مسلم اقلیت کو اس کا دستوری حق نہیں مل رہا ہے۔ پھر کیوں نہیں آپ نے اس کو روک دیا۔ میں نے کہا کہ کسی گروہ کو اس کا حق دستوری الفاظ کی بنیاد پر نہیں ملتا بلکہ اس کے اپنے استحقاق کی بنا پر ملتا ہے۔ آپ اگر دستور میں لکھا ہوا حق لینا چاہتے ہیں تو اس قسم کی پرجوش تقریر نہ کیجئے۔ بلکہ مسلمانوں کو تعلیم اور دوسرے شعبوں میں آگے بڑھا کر اس قابل بنا دیجئے کہ وہ اپنا حق وصول کرنے کے قابل ہو جائیں۔

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا جو لکھنے اور بولنے والا طبقہ ہے، اس

کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم معاملات میں اپنے لئے اپوزیشن سے رہنمائی لیتا ہے۔ اپوزیشن کا سیاسی فائدہ یہ ہے کہ وہ حکمراں پارٹی کو بدنام کرے۔ چنانچہ فرقہ وارانہ فساد یا اور کسی موقع پر اپوزیشن کے افراد فوراً یہ کرتے ہیں کہ اس کو لے کر انتظامیہ کی مذمت شروع کرتے ہیں۔ اس پالیسی کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام انتظامیہ (یعنی حکمراں پارٹی) سے بدظن ہو جائیں اور اگلے الکشن میں ان کو ووٹ نہ دیں۔

مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے بھی عین یہی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ ہر مسئلہ میں ان کو بس کہنے کی ایک ہی بات معلوم ہے، اور وہ یہ کہ "انتظامیہ" کو ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف مذمتی بیانات شائع کریں۔

یہ پالیسی ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ ہم کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ انڈیا میں جو ہندو مسلم معاملہ ہے اس کا بہت کم تعلق نام نہاد انتظامیہ سے ہے۔ اس کا زیادہ تر تعلق مسلم عوام اور ہندو عوام سے ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوش گوار تعلقات پیدا کریں اور لوگوں کو یہ نصیحت کریں کہ وہ اختلافی معاملات میں صبر و ضبط اور حکمت و تدبیر سے کام لیں نہ کہ جوش اور مشتعل مزاجی سے۔ اس کے سوا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے وہ تباہ کن ثابت ہوگا۔

ایک مجلس میں کسی نے کہا کہ ملک میں سب سے بڑا مسئلہ روزگار کا مسئلہ ہے۔ مسٹر مدھو مہتا نے کہا کہ یہ بات صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہمارے دیش میں لوگوں کے اندر کام کرنے کا جذبہ نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بس انھیں ایک ملازمت مل جائے اور پھر کام نہ کر کے بھی تنخواہ لیتے رہیں۔

انھوں نے کہا کہ میں امریکہ گیا اور وہاں مختلف لوگوں سے ملا۔ میں نے پایا کہ ایک امریکی نوجوان جس کے پاس کوئی جاب نہ ہو وہ اپنے بارہ میں بتاتے ہوئے یہ کہے گا کہ میں کام کی تلاش میں ہوں:

I am for work.

اور انڈیا میں معاملہ اس کے الٹا ہے۔ انڈیا کا ایک نوجوان بے روزگار ہے تو وہ اپنی حالت کو بتاتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ میں ایک جاب کی تلاش میں ہوں:

I am looking for a job.

ریکہ کا نوجوان " کام " کی تلاش میں ہوتا ہے، اور انڈیا کا نوجوان " ملازمت " کی تلاش میں۔ دونوں دیشوں کے مزاج میں جو فرق ہے وہ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے۔

بمبئی میں مسلسل ملاقاتوں اور میٹنگوں کی وجہ سے اخبار پڑھنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا۔ تاہم م ازکم ایک اخبار میں ضرور پڑھ لیتا تھا۔ جب کہ دہلی میں روزانہ میں چار اخبار دیکھتا ہوں۔

ٹائمس آف انڈیا (۳ فروری ۱۹۹۳) میں علی گڑھ کی ایک رپورٹ تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سلم یونیورسٹی کے چند لڑکوں نے بعض نام نہاد لیڈروں کی کال پر ۲۶ جنوری کو کالا جھنڈا لگایا۔ مگر وہاں کے مسلمانوں نے اس کی سخت مذمت کی۔ رپورٹر نے لکھا تھا کہ ۲۶ جنوری کو میں علی گڑھ شہر میں گیا۔ یکن وہاں کسی ایک گھر کے اوپر بھی کالا جھنڈا نظر نہیں آیا:

This correspondent could not spot a single black flag on any house. (p.17)

رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اب علی گڑھ کے مسلم نوجوان یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ندت پسند لوگ (hardliners) مسلمانوں کو رہنمائی دینے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ سلمانوں کو حقیقت پسند اور روشن خیال قیادت (realistic and enlightened leadership) کی ضرورت ہے۔ یہ صرف علی گڑھ کی بات نہیں۔ یہ آج ملک کے تمام مسلمانوں کی آواز ہے۔ اب وہ حالات پوری طرح تیار ہو چکے ہیں جب کہ مسلمانوں کے درمیان نئی صالح قیادت ابھرے اور سلمانوں کی طرف سے اس کا استقبال کیا جائے۔

۳ فروری کی دوپہر کو میں بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔ جے جے ہاسپٹل کے پاس ایک ٹوٹی ہوئی عمارت دکھائی دی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ پولیس چوکی ہے۔ حالیہ فساد کے دنوں میں اس کو مسلمانوں کے ہجوم نے توڑنے کی کوشش کی تھی۔

ہندستان کے مسلم لیڈروں نے عام طور پر اپوزیشن کی بولی کو اختیار کر لیا ہے۔ اپوزیشن کے یڈر مخصوص مصالح کے تحت ہمیشہ پولیس یا انتظامیہ کے خلاف بیان دیا کرتے ہیں۔ اس کی نقل ں نام نہاد مسلم لیڈر بھی یہی کر رہے ہیں۔ ہر فساد کے بعد وہ آنکھ بند کرکے ایک ہی بیان جاری

کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ انتظامیہ (پولیس) نے فساد کرایا۔

اس طرح کے بیانات کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ مسلمان عام طور پر پولیس کے بارہ میں منفی سوچ کا شکار رہتے ہیں۔ اس لئے جب وہ پولیس کی پارٹی کو دیکھتے ہیں تو فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں انتہائی غیر ضروری طور پر مسلم — پولیس تصادم پیش آتا ہے۔ پولیس کی مفروضہ مسلم دشمنی حقیقۃً مسلم لیڈروں کے غلط بیانات کا نتیجہ ہے۔ مگر اس کو خلاف واقعہ طور پر ہمارے اخبارات پولیس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

۴ فروری کی شام کو ۵ بجے خلافت ہاؤس میں تقریر تھی۔ ڈاکٹر رفیق زکریا صدارت کر رہے تھے۔ ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ باہر بھی کافی آدمی کھڑے ہوئے تھے میں نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا: اس نازک وقت میں بمبئی میں کیوں آیا۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ جو کہانی آپ نے بار بار خون کے قطروں سے لکھنے کی کوشش کی مگر وہ لکھی نہ جا سکی۔ اب ایک بار ہم اس کہانی کو آنسوؤں کے قطروں سے لکھنے کی کوشش کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ ہماری دل فگاری کو قبول کر لے۔ جو کہانی خون کے قطروں سے لکھی نہ جا سکی وہ آنسوؤں کے قطروں سے لکھ کر تیار ہو جائے۔

میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان اٹھا۔ اس نے زور زور سے کہنا شروع کیا: ہم نہیں سنیں گے۔ تم واپس جاؤ۔ وغیرہ۔ میں خاموش ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ہال کے حاضرین میں سے بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے ہیں اور اس نوجوان سے کہہ رہے ہیں کہ تم کو نہیں سننا ہے تو تم یہاں سے چلے جاؤ۔ کیوں کہ ہمیں تو سننا ہے۔ کچھ دیر تک آوازوں کا شور رہا۔ آخر کار وہ لڑکا باہر چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی اور سارا مجمع نہایت خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ حاضرین کی فرمائش پر میں نے اس موقع پر تین نکاتی فارمولا کی وضاحت کی۔

۴ فروری کو بمبئی میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ حالات اب تو یہاں کافی اعتدال پر آگئے ہیں مگر پچھلے ہفتہ تک عجیب حال تھا۔

انھوں نے بتا کہ لوکل ٹرینوں میں لوگ خاموشی سے داخل ہو جاتے اور مکمل طور پر چپ رہتے۔ کوئی شخص بھی بولتا نہیں تھا۔ ڈبوں کے اندر ٹرین کے چلنے کی آواز کے سوا کوئی اور آواز مطلق سنائی

نہیں دیتی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ممبئی سے تھانے تک ٹرین میں سفر کیا۔ یہ تقریباً ایک گھنٹہ کا سفر تھا۔ مگر پورے سفر میں کوئی انسانی آواز سنائی نہ دی۔ لوگوں کو ڈر ہوتا تھا کہ اگر وہ بولیں تو فوراً ان کی آئیڈنٹٹی معلوم ہو جائے گی۔ اگر کبھی بولنا ضروری ہو جائے تو لوگ سوچنے لگتے تھے کہ ہندی میں بولیں یا مراٹھی میں۔ انھوں نے بتایا کہ عام طور پر ٹرینوں میں لوگ وقت گزارنے کے لیے تاش کھیلتے ہیں یا بھجن گاتے ہیں۔ مگر فساد کے دنوں میں سب کچھ مکمل طور پر بند ہو گیا تھا۔

۴ فروری کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت میں ۳۰ ویں منزل پر جانا ہوا۔ یہاں ایڈیٹرس گلڈ کی کی میٹنگ تھی جس میں مجھ کو خطاب کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ "اڈیٹرس گلڈ" کے زیر اہتمام دہلی کے ممتاز جرنلسٹوں کی ایک ٹیم ممبئی آئی تھی تاکہ یہاں کے فساد کے بارہ میں فرسٹ ہینڈ معلومات حاصل کرے۔ یہ سب لوگ یہاں موجود تھے۔ چالیس سے زیادہ کی تعداد میں تمام بڑے بڑے ہندی اور انگریزی اخباروں کے ایڈیٹر اس میں شریک ہوئے۔ ہال کی ساری سیٹیں بھر گئیں۔ آخر کار مزید کرسیاں منگانی پڑیں۔ زیادہ تر ہندو اور کچھ کرسچین تھے۔ کنڈکٹر نے آغاز کرتے ہوئے کہا:

Unusually it is a very large meeting.

مقررین نے ممبئی کے فساد پر زیادہ تر انتظامیہ کو سخت سست کہا۔ ایک صاحب نے پرجوش طور پر بولتے ہوئے کہا:

Who is policing the police.

دوسرے نے کہا کہ اصل قصور پولیس کا نہیں ہے بلکہ سیاسی لیڈروں کا ہے۔ پولیس کسی مجرم کو پکڑتی ہے اور اس کو سزا دینا چاہتی ہے۔ مگر فوراً ہی کسی لیڈر کا ٹیلی فون پولیس افسر کو پہنچ جاتا ہے کہ یہ میرا آدمی ہے، اس کو چھوڑ دو۔ لیڈر جب تک پولیس کے کام میں دخل دینا نہیں چھوڑیں گے، امن نہیں ہو سکتا۔

اکثر لوگ غصہ کے انداز میں بول رہے تھے کہ آخر اس قسم کے بھیانک فساد ملک میں کیوں ہوتے ہیں۔ ہر آدمی لمبی لمبی تقریر کرتا تھا۔ مگر اس کی تقریر زیادہ تر غیر متعلق باتوں سے بھری رہتی تھی۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ پر جب بھی گفت گو ہوتی ہے تو اس کا عنوان ہوتا ہے: انڈیا میں فساد کا مسئلہ۔ حالاں کہ یہ عنوان ہی غلط ہے۔ کیوں کہ فساد جو ہو رہا ہے وہ پورے انڈیا میں نہیں ہو رہا ہے۔ وہ زیادہ تر نارتھ انڈیا میں ہو رہا ہے۔ گویا کہ اس وقت ہم جس مسئلہ کے حل کے بارہ میں بحث کر رہے ہیں، وہ آج بھی انڈیا کے نصف حصہ میں حل شدہ ہے۔ ایسی حالت میں کوئی نئی بحث چھیڑنے کے بجائے ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ ملک کے محفوظ حصہ (ساؤتھ انڈیا) کا مطالعہ کرکے جانیں کہ وہاں فساد کیوں نہیں ہوتا۔

میں نے اس کی تحقیق کی ہے۔ میری دریافت یہ ہے کہ ساؤتھ انڈیا کے لوگوں میں برداشت کرنے کا مزاج ہے، اسی لئے وہاں فساد نہیں ہوتا۔ اس بنا پر میری رائے میں فساد کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگوں میں برداشت کا مزاج پیدا کیا جائے۔ برداشت کا مزاج آتے ہی فساد اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ اور یہ کام سب سے زیادہ اخبارات کر سکتے ہیں۔

۵ فروری ۱۹۹۳ کی شام کو انڈین ایرلائنز کے ذریعہ بمبئی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ بمبئی ایرپورٹ پر اور جہاز میں کئی لوگ ایسٹ ویسٹ ایرلائنز کی بات کرتے ہوئے سنائی دئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں تو ایسٹ ویسٹ سے سفر کرنا چاہتا تھا، مگر اس میں جگہ نہیں ملی۔

چالیس سال پہلے ایک ایکٹ (Air Corporation Act 1953) پاس ہوا تھا۔ اس کے سکشن ۱۸ کے مطابق، انڈیا میں سرکاری ہوائی کمپنی کے سوا کسی اور شخص یا ادارہ کے لئے ہوائی جہاز چلانا غیر قانونی تھا۔ مگر موجودہ حکومت نے پرائیویٹ کمپنیوں کو ہوائی سروس کی اجازت دے دی ہے۔ چنانچہ تقریباً چالیس کی تعداد میں پرائیویٹ ہوائی کمپنیاں قائم ہو گئی ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ بہتر ایسٹ ویسٹ ایرلائنز سمجھی جاتی ہے جو مسلمانوں نے قائم کی ہے اور اس کے چیرمین نصیر الدین عبد الوحید ہیں۔ ایسٹ ویسٹ خود سرکاری انڈین ایرلائنز کے لئے چیلنج بنتی جا رہی ہے۔

جس ملک میں یہ امکانات ہوں کہ ایک مسلم ادارہ قائم ہو کر اتنی ترقی کرے کہ وہ خود گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے چیلنج بن جائے، اس ملک میں جو لوگ کہتے کہ یہاں مسلمانوں کے لئے کوئی اسکوپ نہیں، وہ ملک کے بارہ میں خبر نہیں دیتے بلکہ خود اپنی بے بصیرتی کا اعلان کر رہے ہیں۔

مدراس کا سفر

پیس مشن کے تحت ایک سفر ہوا۔ اس کا راستہ اس طرح تھا ـــــ دہلی، مدراس، کانچی پورم، منگلور، سرنگیری، بمبئی، پونہ، دہلی۔ اس سفر میں میرے ساتھ حسب ذیل مزید افراد شامل تھے: اچاریہ سوشیل کمار، سوامی چیدانند، مدھو مہتا، شانتی لال موتھا، نائجل ایڈمنڈ ٹولی۔ اس سفر کی مختصر روداد تاریخ وار درج کی جاتی ہے۔

۱۵ فروری ۱۹۹۳

صبح فجر سے پہلے نظام الدین سے روانہ ہو کر دہلی ایر پورٹ پہنچا۔ ایر پورٹ پر ساڑھے پانچ بجے نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو یہ الفاظ زبان پر آگئے: یا اللہ، آپ کا ایک کمزور ترین بندہ ایک مشکل ترین کام کے لئے نکلا ہے۔ اس کی مدد فرمائیے۔ ملک میں امن قائم فرمائیے اور اہل وطن کے لئے اپنی رحمت و برکت کے دروازے کھول دیجئے۔

دہلی سے مدراس کے لئے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۳۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ دہلی سے اس قافلہ میں اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند اور نائجل ٹولی (آسٹریلیا) شریک تھے۔ مدراس پہنچ کر مسٹر مدھو مہتا (ہندستانی اندولن) اور مسٹر شانتی لال موتھا بھی اس میں شامل ہو گئے۔ یہ دونوں بمبئی سے براہ راست مدراس پہنچے تھے۔

دہلی اور مدراس کے درمیان سفر میں اچاریہ جی اور سوامی جی سے اس پر بات ہوئی کہ ملک میں امن و امان کس طرح قائم ہو۔ دونوں نے اس سے اتفاق کیا کہ بے غرض اور غیر متعصب قسم کی مذہبی شخصیتوں کو سامنے آنا چاہئے۔ ایسے ہی لوگ اس وقت کوئی موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سوامی جی نے کہا کہ بہتر انسانی تعلقات میں سب سے زیادہ جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ ایگو ہے۔ "میں" کا ذہن ٹکراؤ پیدا کرتا ہے، اور اگر میں کا ذہن ختم کر دیا جائے تو اپنے آپ میل ملاپ ہو جائے گا:

The term "I" in the vertical form stands for ego, but in the horizontal form it becomes a bridge between two points.

موجودہ حکومت کی اوپن اسکائی پالیسی (open-sky policy) کے نتیجہ میں اس وقت تقریباً چالیس پرائیویٹ ہوائی کمپنیاں ملک میں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک ایسٹ ویسٹ (East West Air Ways) ہے۔ اس کو بمبئی کے مسلمانوں نے قائم کیا ہے۔ اس کے مینیجنگ ڈائرکٹر ٹی اے وحید ہیں۔ یہ ایک بڑی کمپنی ہے جو ۱۶ اسکٹرز میں اپنے دس جہاز چلا رہی ہے۔

انڈیا کے مسلمانوں میں سے جو لوگ مسائل تلاش کر کے ان میں الجھے رہتے ہیں، ان کے پاس شکایت اور احتجاج کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر جو لوگ مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو تلاش کرتے ہیں ان کو یہاں ایسے مواقع مل جاتے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرلیں۔

درمیان میں ہمارا جہاز کچھ دیر کے لئے حیدرآباد میں اترا۔ اس کے بعد وہ مزید پرواز کر کے مدراس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ مدراس میں ہم لوگوں کا قیام ایک ہندو تاجر کے مکان پر تھا۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا گیا۔ کھانے کی میز کے گرد کئی مقامی اور غیر مقامی ہندو صاحبان موجود تھے۔ وہ لوگ مسلسل بات کرتے رہے۔ میں خاموشی کے ساتھ صرف ان کی باتیں سنتا رہا۔

اس گفتگو کے بعد میری وہ رائے مزید پختہ ہوگئی جو اس سے پہلے اپنے مطالعہ کے دوران میں نے قائم کی تھی۔ وہ یہ کہ مسٹر محمد علی جناح نے ۱۹۴۷ سے پہلے جو سیاست مسلمانوں کے درمیان چلائی، ٹھیک اسی انداز کی سیاست اب ہندو انتہا پسند ہندوؤں کے درمیان چلا رہے ہیں۔

یہ خطرہ کی سیاست ہے۔ مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے کچھ فرضی یا واقعی باتوں کو لیکر مسلمانوں کو بتایا کہ ہندو تمہارے لئے زبردست خطرہ ہے۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد وہ تمہارے ملی وجود کو مٹا دے گا۔ وہ تم کو ترقی نہیں کرنے دے گا۔ اسی کے ساتھ زرد صحافت کو استعمال کر کے انھوں نے بیشتر مسلمانوں کو بہکایا۔ انھوں نے نان اشو کو اشو بنایا اور پھر اس کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کر کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکا دیا۔ اس کا نتیجہ ملک کا بٹوارہ تھا۔

اب ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈر ٹھیک اسی مریضانہ سیاست کو ہندوؤں میں دہرا رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو خطرہ کے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ بے بنیاد باتوں کو لے کر انھیں اشو بنایا۔ ان کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ انھوں نے ہندوؤں کو یقین دلایا کہ مسلمان اس ملک کے لئے مستقل خطرہ ہیں۔ حتی کہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے ذریعہ کچھ برسوں کے بعد وہ بھارت کو اسلامستان

بنا دیں گے۔

اس جذباتی سیاست نے پہلے ملک کا بٹوارہ کیا تھا۔ اب وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا بٹوارہ کر رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں میں اتنی زیادہ دوری آ چکی ہے کہ ایک سماج میں دونوں کا معتدل طور پر رہنا ہی ناممکن دکھائی دینے لگا ہے۔ مزید دردناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے نااہل لیڈر اپنی ناعاقبت اندیشانہ کارروائیوں کے ذریعہ اس دوری میں صرف اضافہ کا سبب بن رہے ہیں۔

مدراس سے سنکر اچاریہ کے یہاں جانا تھا۔ چنانچہ یہاں سے بذریعہ کار کانچی پورم کے لئے روانگی ہوئی۔ وہاں ہم لوگ ڈھائی بجے دن میں پہنچے۔ کانچی کے سنکر اچاریہ (جگت گرو سنکر اچاریہ) سے تقریباً دو گھنٹہ کی ملاقات رہی۔ یہ آشرم کافی بڑا ہے۔ مگر وہ اتنا ہی سادہ ہے۔ نظم اور صفائی کا زیادہ اہتمام نظر نہیں آتا۔

کانچی کے سنکر اچاریہ معمر ہیں اور انتہائی سادہ مزاج آدمی ہیں۔ گفتگو میں ہنسی کا انداز غالب رہتا ہے۔ ابتدائی مشاہدہ میں مجھے خیال ہوا کہ وہ بالکل سیدھے سادے ایک سنت ہیں۔ مگر بات چیت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اور ہر معاملہ میں نہایت جچی تلی رائے دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے احوال سے بھی وہ کافی باخبر نظر آئے۔

سنکر اچاریہ نے جو باتیں کہیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ مندر اور مسجد کا جھگڑا اس طرح طے کیا جانا چاہئے کہ دیش کی شانتی بھنگ نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ دیش میں اگر شانتی نہ ہو تو اس کے بعد دوسرا کوئی بھی کام نہیں کیا جا سکتا۔

اسی دن ہم لوگ کانچی پورم سے لوٹ کر مدراس آ گئے۔ یہاں شام کو نماز مغرب کے بعد ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ مدراس کے انگریزی اور تامل اخباروں کے رپورٹر موجود تھے۔ یو این آئی کی طرف سے بھی ایک نمائندہ اس میں شریک تھا۔ گفتگو زیادہ تر اجودھیا کے مسئلہ پر ہوئی۔ میں نے تین نکاتی فارمولا کی وضاحت کی۔ اس پریس کانفرنس میں میرے علاوہ اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند بھی موجود تھے۔

۱۶ فروری ۱۹۹۳

مدراس میں کئی تعلیم یافتہ افراد سے ملاقات ہوئی۔ ایک ہندو تاجر مسٹر سی ایل ہیتا نے کہا کہ اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جو کچھ ہوا، اس کا مکمل ویڈیو فلم تیار کیا گیا تھا۔ اس کو اب جگہ جگہ دکھایا جارہا ہے۔ اگر پہلے سے اس کا منصوبہ نہ بنایا گیا ہوتا تو اس عمل کا پورا فلم کیسے تیار کیا جاسکتا تھا۔ اس فلم کے اثرات بے حد خطرناک ہیں۔ ایک ہندو نوجوان نے اس فلم کو دیکھ کر کہا: آخر کار ہم نے فتح پالی۔ ایک اور ہندو نوجوان اس کو دیکھنے کے بعد بول اٹھا: غلامی کا نشان مٹ گیا۔ ایک اور ہندو نوجوان نے کہا، مسلمان دباؤ کی بھاشا سمجھتے ہیں، یہ بات اب پکی ہوگئی۔

مدراس سے ہم لوگوں کو منگلور جانا تھا۔ اور پھر وہاں سے سرنگیری جاکر دوسرے سنکراچاریہ سے ملنا تھا، قیام گاہ سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے تو گاڑی میں میرے ساتھ آسٹریلیا (سڈنی) کے ۳۴ سالہ مسٹر نائجل ایڈمنڈ ٹولی (Nigel Edmund Tolley) بھی موجود تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ انڈیا اور آسٹریلیا میں آپ نے کیا فرق دیکھا۔ انھوں نے بہت سے مادی فرق بتائے مثلاً زیادہ آمدنی، زیادہ صاف سڑکیں، زیادہ اچھے گھر، ہر چیز اعلیٰ صنعتی معیار کی۔

میں نے کہا کہ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آسٹریلیا کے لوگ ہندستان سے زیادہ خوش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ خوشی کا تعلق دل سے ہے، اس کا تعلق مادی چیزوں سے نہیں:

Happiness comes from the heart, not from money.

مسٹر ٹولی نے ایک لڑکی سے شادی کی۔ اس سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ مگر چند سال کے بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ اب دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ دونوں غیر مطمئن ہیں۔ دونوں میں سے کسی نے ابھی تک دوسرا نکاح نہیں کیا۔ مغربی ملکوں میں طلاق کی کثرت کی وجہ انھوں نے یہ بتایا کہ آزادی کا تصور اتنا غالب ہے کہ عورتیں مرد کی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔

مدراس سے منگلور کے لئے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۵۵۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں انڈین اکسپریس (۱۶ فروری) دیکھا۔ اس میں صفحہ ۶ پر ایک کتاب کا تذکرہ تھا:

Dr Barbara Theiring, Jesus the Man

ڈاکٹر باربرا نے ۲۰ سال تک بحر مردار کی دستاویزات (Dead Sea scrolls)

کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مذکورہ کتاب تیار کی ہے۔ اس میں حضرت مسیح کی زندگی کے جو حالات ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہیں جو موجودہ انجیل میں ہیں یا مسیحی چرچ میں بتائے جاتے ہیں۔ اس کے مطابق حضرت مسیح نے دو بار نکاح کیا۔ ان کے یہاں بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک بچی کا نکاح پال سے ہوا۔ حضرت مسیح سولی کے بعد بھی زندہ رہے۔ اور بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر ان کی وفات ہوئی۔ وغیرہ۔ مبصر نے ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> The Christ whom Christians worship and the Jesus of the New Testament do not appear to be the same person. The former is the romantic product of theology and the latter, an intolerant prophet who denied his own mother at a wedding party, cursed a tree for not bearing fruit, promised to divide family members against each other.

۱۰ بجے دن میں ہمارا جہاز منگلور کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ ہمارے قافلہ میں پانچ آدمی تھے۔ یہاں سے ہم لوگ کار کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ سڑک کے دونوں طرف دور تک سرسبز وادیوں کا منظر پھیلا ہوا تھا۔ تاہم مسلسل سفر کی وجہ سے میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ سر کے اندر چکر کی سی کیفیت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ قدرتی مناظر کو دیکھنے کی خوشی حاصل کروں۔ مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ذہنی حالت اس میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

میرے دل نے کہا کہ قادر مطلق کی شان کے خلاف ہے کہ وہ انسان کو امپرفکٹ دنیا دے مگر وہ اس کو پرفکٹ دنیا سے محروم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا یہ محسوس کرنا کہ یہ دنیا اس کے لئے امپرفکٹ ہے، یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ پرفکٹ دنیا بھی ضرور اس کے لئے تیار کی گئی ہے۔

منگلور سے بذریعہ روڈ ہم نے ڈھائی گھنٹہ کا سفر طے کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ ڈیڑھ بجے دن میں سرنگیری (Sirengeri) میں داخل ہو گئے۔ یہیں پربستی کے کنارے ایک بڑے رقبہ میں سنکراچاریہ کا آشرم ہے جو ۱۲ سو سال سے قائم ہے۔

سرنگیری میں ایک معلوماتی کتاب ۱۲۵ صفحہ کی ملی۔ یہ ۱۹۹۱ میں انگریزی میں چھاپی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جگد گرو آدی سنکراچاریہ (۸۲۰ - ۷۸۸ء) نے صرف ۳۲ سال کی عمر پائی۔ مگر انھوں نے انڈیا کی تاریخ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ انھوں نے دیش بھر کا سفر کر کے چار کونوں پر

چار مٹھ بنائے۔ دوارکا (ویسٹ) بدری کسرنا (نارتھ) جگنا تھ (ایسٹ) سرنگیری (ساؤتھ)

تعارفی کتاب کا ایک ذیلی عنوان ٹیپو سلطان کے بارہ میں ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ٹیپو سلطان کے کئی خطوط مٹھ کے دفتر میں محفوظ ہیں۔ ایک خط کے بارہ میں یہ الفاظ درج ہیں :

In a letter, he reiterated his conviction that his strength and hope were reared upon the three fold basis of God's grace, the holy Jagadguru's blessings, and the prowess of the arms of the realm. (p.68)

سرنگیری کے سنکر اچاریہ سے ملنے کے لئے یہاں کا سفر ہوا ۔ کہا جاتا ہے کہ آدی سنکر اچاریہ نے بھارت میں چار مرکز قائم کرنے کے بعد یہیں قیام کیا تھا۔ ان کے آخری ایام اسی جگہ گزرے۔ سرنگیری مٹھ بالکل جدید طرز پر بنا ہوا ہے۔ ۴۶ ایکڑ کے رقبہ میں واقع اس مٹھ میں نظم اور صفائی اعلیٰ معیار کی نظر آئی۔

یہ مٹھ قدرتی مناظر کے درمیان واقع ہے۔ جگہ نہایت پر فضا ہے۔ پورے ماحول میں ایک خوشگوار سکون چھایا ہوا ہے۔ چڑیوں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز اتفاقاً ہی کبھی سنائی دیتی ہے۔ ندی، باغ پل، پارک، پہاڑیاں، یہ اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

دوپہر کا کھانا ہم لوگوں نے یہاں کھایا۔ میرے علاوہ سوامی چیدانند، مدھو مہتا، شانتی لال مونتھا اور مسٹر ٹولی شریک تھے جو ہندوازم سے متاثر ہیں۔ ایک بڑے کمرہ میں سادہ میز کے چاروں طرف سادہ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز کے اوپر کیلے کے ہرے پتے بچھائے گئے۔ پھر اس پتہ کے اوپر روٹی، چاول، سالن وغیرہ باری باری لاکر رکھا گیا۔

ہر چیز صاف ستھری اور صحت بخش تھی۔ سرنگیری مٹھ کے ایڈمنسٹریٹر ڈاکٹر گوری شنکر (V.R. Gowri Shankar) بھی کھانے میں شریک تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر مٹھ کے اندر اپنے کمرہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد آرام کیا۔ شام کو چار بجے سنکراچاریہ سے ہم لوگوں نے ملاقات کی۔

سنکراچاریہ سے بہت اچھے ماحول میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمارے پیس مشن کی مکمل حمایت کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ دھرم کا مطلب مذہب نہیں ہے۔ بلکہ کرتو

(ڈیوٹی) ہے۔ یہ سیاسی لوگ ہیں جنھوں نے دھرم کو مذہب کا معنی دے دیا ہے۔ دھرم تو انسان کا کرتو ہے۔ جیسے پتنی کا دھرم، راجہ کا دھرم، وغیرہ۔ ہندو کا لفظ ہماری کتابوں میں کہیں نہیں۔ یہ لیڈر ہیں جنھوں نے "ہندو" کو وہ نام دیا ہے جو آج سمجھا جاتا ہے۔

مسٹر مدھو مہتا نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اس ملک میں ہر چیز بزنس ہوگئی ہے۔ حتی کہ روحانیت کو بھی تجارت کی چیز بنا دیا گیا ہے:

Even spiritualism has been commercialised in this country.

۱۷ فروری ۱۹۹۳

آج صبح کو سرنگیری سے واپس ہونا تھا۔ یہاں میں نے اپنے کمرہ میں فجر کی نماز پڑھی۔ سینہ میں جذبات کا تلاطم برپا تھا۔ مگر ایسا محسوس ہوا جیسے کہ جذبات الفاظ کی صورت میں ڈھل نہیں رہے ہیں۔ جذبات جب بہت زیادہ گہرے ہوں تو کیفیات کا غلبہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ الفاظ کے لئے ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ خدایا، اس دعا کو میری طرف سے لکھ لے جس کے لئے میرے پاس الفاظ بھی نہیں۔

ہمارے ساتھی شانتی لال موتھا (پونہ) نے کل شام کو یہاں کے مطبخ میں کہہ دیا تھا کہ صبح کو ہم لوگ اِڈلی کا ناشتہ کریں گے۔ چنانچہ صبح کو ضروریات سے فارغ ہو کر ہم لوگ کھانے کی میز پر آئے تو کیلے کے پتہ پہ اِڈلی، ناریل کی چٹنی اور کافی رکھی ہوئی تھی۔ یہ جنوبی ہند کا عمومی ناشتہ ہے۔ اس سے فراغت کے بعد ہمارا قافلہ سرنگیری سے منگلور کے لئے روانہ ہوا۔

پورا راستہ سبزہ سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے درمیان طے ہوا۔ قدرت کے پھیلے ہوئے مناظر اتھاہ سکون کا پیغام دے رہے تھے۔ کبھی کبھی سامنے سے کوئی گاڑی آتی ہوئی دکھائی دیتی۔ جب سامنے کی گاڑی اور ہماری گاڑی قریب آتی تو ٹرافک اصول کے مطابق، ایک گاڑی دائیں کی طرف اور دوسری گاڑی بائیں کی طرف کترا کر نکل جاتی۔ میں نے سوچا کہ دونوں گاڑی اگر سیدھا چلنے پر اصرار کرے تو دونوں ہی تباہ ہو جائیں۔ اور جب دونوں ایک دوسرے کو اوائڈ کرتی ہیں تو دونوں کو زندگی کی شاہراہ مل جاتی ہے۔

راستہ میں سوامی چیدانند اپنی دلچسپ باتیں سناتے رہے۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ پیار کی

کرنسی ایسی ہے جو دنیا میں ہر جگہ چلتی ہے۔ پھر اس خیال کو موزوں کرتے ہوئے کہا: پیار کا دیا جلاؤ، دشمنی کا اندھیرا بھگاؤ۔

۱۰ بجے دن میں ہم لوگ منگلور ایر پورٹ پر پہنچ گئے۔ یہاں لاونج میں کچھ وقت گزارا۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ ایک ہندو بھائی نے کہا کہ ہم مندر۔ مسجد پالٹکس کو افورڈ نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ بمبئی میں میرا کارخانہ ہے۔ میں ایکسپورٹ کا سامان تیار کرتا ہوں۔ میرے علاقہ میں فساد نہیں ہوا، مگر فساد کی خبریں پھیلیں تو میرے ورک فورس کا ۹۵ فیصد حصہ بھاگ گیا۔ اب میری انڈسٹری ٹھپ پڑی ہوئی ہے۔ بھلا اس طرح دیش ترقی کر سکتا ہے۔

دوسرے ہندو بھائی نے کہا کہ اشوک سنگھل جیسے لوگوں کا کہنا ہے کہ:

دیش کو بچانا ہے غلامی کا کلنک مٹانا ہے۔

مگر یہ نعرہ بالکل الٹا ہے۔ ان لوگوں کو کہنا چاہئے کہ غلامی کا کلنک مٹانے کے نام پر دیش کو تباہ کرنا ہے۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جھوٹی سیاست سے دیش کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ اور پھر خود ہی وہ دیش کو بچانے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔

میں نے سوچا کہ اسی کو فارسی زبان میں کہا گیا ہے کہ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ یہ سیاست کی بدترین قسم ہے۔ اس میں کچھ فرضی چیزوں کو اشو بنایا جاتا ہے۔ اور پھر جذباتی تقریروں کے ذریعہ اس کو بڑھا کر آخری حد پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا قومی نشہ ہے، اس کا قومی ترقی سے کوئی تعلق نہیں۔

انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۱۶۰ کے ذریعہ منگلور سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں آج کے دو اخبار پڑھے۔ انڈین ایکسپرس اور حیدر آباد کا نیوز ٹائم۔ نیوز ٹائم (۱۷ فروری) میں رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف کا ایک انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ اس کو ورلڈ نیوز لنک نے ریکارڈ کیا تھا۔

ایک سوال یہ تھا کہ مسلم دنیا میں جو فنڈ منٹلسٹ تحریکیں چل رہی ہیں ان کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ ڈاکٹر نصیف نے جواب دیا کہ ہر مذہب میں ایسے لوگ ہیں جو اپنے جوش کے تحت رات دن کے اندر نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی ہیں۔ پہلا کام یہ ہے کہ لوگوں میں تعلیم

بڑھائی جائے۔ اخلاقی اقدار پیدا کی جائیں۔ اسی طرح ایک اور سوال یہ تھا کہ سلمان رشدی کے خلاف موت کا فتویٰ جو ایران کے مذہبی لیڈر نے دیا تھا، اس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر نصیف کا حسب ذیل جواب اخبار میں نقل کیا گیا ہے:

Some people, in emotion, pass these resolutions. I think that today we must promote human rights. The death penalty should be only for criminals who commit the crime of killing people. But otherwise, human rights should be given to everybody.

یہ بات اگر ہندستان یا پاکستان کا کوئی شخص کہے تو نام نہاد علماء اس کے قتل کا یا کم از کم اس کو کوڑا مارنے کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ مگر یہی پرجوش حامیان اسلام اس وقت خاموش رہتے ہیں جب کہ وہ سعودی عرب کے کسی ذمہ دار شخص کی طرف سے کہی گئی ہو۔ کیسا عجیب ہوگا وہ اسلام جو بھارت جیسے ملک میں کچھ اور رہو اور پٹرو ڈالر والے ملک میں پہنچتے ہی کچھ اور ہو جائے۔

بمبئی میں ہمارے ساتھی ایرپورٹ پر موجود تھے۔ تاہم پروگرام کے مطابق، آج پونہ جانا تھا۔ بمبئی میں دو گھنٹے گزار کر بذریعہ کار پونہ کے لئے روانگی ہوئی۔

مسٹر شانتی لال موتھا نے مجھ کو پیچھے کی سیٹ پر لٹا دیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شانتی لال موتھا نے پوچھا کہ آپ کو کیا چاہئے۔ کیا چائے یا کولڈ ڈرنک وغیرہ۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سڑک کے کنارے کوئی مسجد ہو تو اتر کر نماز پڑھ لوں۔ انھوں نے کہا کہ مسجد تو ابھی ہمارے پیچھے تھی۔ فوراً گاڑی روک کر پیچھے کی طرف لے گئے۔ اور مسجد کے پاس اس کو کھڑا کر دیا۔ میں نے اتر کر وہاں نماز پڑھی اور پھر ہم لوگ آگے کے لئے روانہ ہوئے۔

مغرب کے وقت ہم لوگ پونہ پہنچ گئے۔ یہاں پہلے مسٹر شانتی لال موتھا کے آفس میں ٹھہرا۔ کچھ دیر بعد جناب عبد الصمد صاحب اور جناب محمد یونس صاحب آگئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں نیو ایرا کالونی میں آگیا۔ یہاں میرا قیام محمد یونس صاحب کے مکان پر تھا۔ پونہ کے کئی لوگ خبر سن کر یہاں آگئے۔ رات ساڑھے گیارہ بجے تک ان لوگوں سے بات ہوتی رہی۔

میں نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ ہندو مسلم تعلقات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ

کی ضرورت ہے۔ اکثر مسلمان ایسا کرتے ہیں کہ وہ برادران وطن کو حلقوں اور جماعتوں میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں۔ یہ آر ایس ایس کا آدمی ہے۔ یہ کانگرس کا آدمی ہے۔ یہ بھارتیہ جنتا پارٹی کا آدمی ہے۔ یہ اس جماعت کا آدمی ہے۔ یہ اُس جماعت کا آدمی ہے۔ اس قسم کی سوچ سراسر بے بنیاد ہے۔ صحیح اسلامی بات یہ ہے کہ تمام لوگوں کو انسان کی نظر سے دیکھا جائے۔ جماعتی تعلق ہمیشہ اضافی ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر ایک انسان ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ انسان کے اعتبار سے معاملہ کرنا چاہئے۔

۱۸ فروری ۱۹۹۳

آج فجر کی نماز نیو ایرا (پونہ) کی مسجد میں پڑھی۔ امام صاحب نے آخری رکعت میں قرآن کا جو حصہ پڑھا، اس کی آخری آیت یہ تھی: واصبر وما صبرك إلا بالله ولا تحزن عليهم ولا تك في ضيق مما يمكرون۔ إن الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون (النحل ۱۲۷-۲۸)

نماز کے بعد کچھ لوگ میری قیام گاہ پر اکٹھا ہو گئے۔ میں نے مذکورہ آیات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ قرآن کے اس بیان پر غور کیجئے تو اس میں آپ کو موجودہ حالات کے اعتبار سے بہت بڑا سبق ملے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنائی ہے کہ یہاں ہمارا اصل مسئلہ ہمارے خلاف سازش کی موجودگی نہیں ہوگی۔ بلکہ اصل مسئلہ خود ہمارے اندر صبر اور تقویٰ اور حسن عمل کی غیر موجودگی ہوگی۔ گویا یہاں سارا معاملہ خود ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ ہمیں باہر کی سازشوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ خود اپنے اندر تقویٰ اور صبر اور حسن عمل کی صفت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر داخلی سطح پر ہمارے اندر یہ اوصاف موجود ہوں تو اس کے بعد تمام بیرونی مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

پونہ کے تعلیم یافتہ افراد میری رہائش گاہ پر آتے رہے اور ان سے مختلف قسم کے دینی اور ملی امور پر باتیں ہوتی رہیں۔ عبد القادر عبد الغنی صاحب (۵۳ سال) نے گفتگو کے دوران کہا کہ آج کا مسلمان جھگڑا بالکل نہیں چاہتا۔ آج اگر مسلمان لیڈر کسی جھگڑے والی بات کے لئے بلائیں تو مسلمانوں کی طرف سے انھیں کوئی رسپانس ملنے والا نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ۶ دسمبر کے حادثہ کا ایک روشن پہلو ہے۔ ۶ دسمبر کو جب بابری مسجد کی عمارت ڈھائی گئی تو اسی کے ساتھ موجودہ نام نہاد مسلم قیادت بھی ہمیشہ کے لئے ڈھ گئی۔

شام کو نماز عشاء کے بعد ڈاکٹر عبدالرزاق شیخ کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کے تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے اجودھیا کے مسئلہ پر تقریر کی اور تین نکاتی فارمولا کی تشریح کی۔ آخر میں سوال وجواب پر مجلس برخاست ہوئی۔ بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا کا پونہ کے لئے ایک ضمیمہ نکلتا ہے۔ اس کا نام پونے پلس (Pune Plus) ہے۔ ڈاکٹر شیخ کا ایک مراسلہ اس کے کل کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے تین نکاتی فارمولا کی مکمل حمایت کی ہے۔

۱۹ فروری ۱۹۹۳

صبح ساڑھے نو بجے پونہ کے اردو ٹاورس کے ہال میں وسیع پیمانہ پر ایک کانفرنس ہوئی۔ حاضرین میں پونہ کے ہر طبقہ کے ممتاز افراد شریک ہوئے۔ میرے علاوہ، اچاریہ سوشیل کمار، اور سوامی چیدانند کی تقریریں ہوئیں۔ تقریر کے بعد سوال وجواب ہوا۔ پریس کے لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ چنانچہ اگلے دن انگریزی، مراٹھی، ہندی، کے تمام اخباروں میں مفصل رپورٹیں شائع ہوئیں۔

شام کو ۵ بجے سندھیوں کے بڑے گرو دادا واسوانی سے ان کے آشرم پر ملاقات ہوئی۔ وہ تواضع اور شرافت اور انکسار کی سراپا تصویر تھے۔ انھوں نے مسجد کو گرا کر وہاں مندر بنانے پر بہت دکھ کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا:

They are killing the spirit of India.

انھوں نے کہا کہ اگر اجودھیا میں رام مندر بنتا ہے تو اس کے ساتھ وہیں ایک مسجد بھی بننا چاہئے۔ اور اگر ایسا ہوا تو میں خود وہاں جاکر اذان دوں گا اور وہاں نماز پڑھونگا۔

مغرب کی نماز پونہ میں پڑھ کر بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر بذریعہ روڈ طے ہوا۔ اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند بھی ساتھ تھے۔ راستہ میں ایک چھوٹے بازار میں کچھ کام کے لئے رکے۔ دکاندار نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس نے کہا کہ ابھی ہم نے آپ لوگوں کو ٹی وی پر دیکھا ہے۔ ٹی وی کسی شخصیت کی توسیع ہے۔ وہ اس عقیدہ کو قابل فہم بناتا ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔

رات کو ساڑھے دس بجے ہم لوگ بمبئی پہنچے۔

۲۰ فروری ۱۹۹۳

فجر کی نماز بمبئی میں جوہو اسکیم میں پڑھی۔ صبح کا کچھ وقت یہاں گزرا۔ اس کے بعد ہمیں میکر ٹاورس پہنچنا تھا۔ ہمارا سامان فلیٹ کاروں میں روانہ ہوا۔ میں مسٹر افضل الانہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے نئے تھے۔ وہ الکٹرانک سنٹر چلاتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے نئی ماروتی کار خریدی ہے۔ اس پر وہ مجھ کو لے کر روانہ ہوئے۔

لمبے راستہ میں ایک گھنٹہ تک زیادہ تر وہی بولتے رہے۔ ان کی گفتگو تمام کی تمام اس پر تھی کہ آج مسلم نوجوانوں میں زبردست فرسٹریشن ہے۔ یہ فرسٹریشن لڑائی جھگڑے کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ انھوں نے موجودہ حالات کی ذمہ داری سب سے زیادہ ملکی تعصب پر ڈالی۔

ان کے ذاتی حالات معلوم کرتے ہوئے مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ بمبئی آئے تو انھوں نے ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کی "بیگار" پر کام کرنا شروع کیا۔ عام رواج کے خلاف، انھوں نے کبھی سیٹھ سے تنخواہ اور الاؤنس بڑھانے کی بات نہیں کی۔ وہ بس اپنے کام میں محنت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کو کافی تجربہ ہو گیا۔ اب وہ الکٹرانکس میں اپنا ذاتی کاروبار کرتے ہیں اور بمبئی میں کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

آخر میں میں نے کہا کہ آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی عملی زندگی الگ ہے، اور آپ کی سوچ الگ۔ آپ نے اپنی زندگی کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ بلاشبہ کامیابی کا طریقہ تھا۔ مگر یہ طریقہ آپ کی سوچ میں شامل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی زبان سے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ انڈیا میں مسلم نوجوانوں کے لئے کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔ حالاں کہ عین اسی وقت آپ اسی انڈیا میں مکمل کامیابی حاصل کئے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ ہی جیسا معاملہ آجکل اکثر مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ یہاں لاکھوں لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ذات کی سطح پر محنت کرکے کامیاب زندگی حاصل کی ہے۔ مگر جب وہ بولتے ہیں تو وہ اپنی زندگی کا تجربہ بیان نہیں کرتے۔ بلکہ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر شکایت اور مایوسی کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ اگر صرف یہ کریں کہ وہ خود اپنا تجربہ لوگوں کے سامنے بیان کریں تو

ملت کا آدھا مسئلہ حل ہو جائے۔

۱۰۰۰ ق م میں بمبئی صرف مچھیروں کی ایک معمولی بستی تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں یہ علاقہ اشوک کی سلطنت کا حصہ بنا۔ اس کے بعد وہ مختلف راجاؤں کے ماتحت رہا۔ ۱۲۹۴ میں وہ خلجی خاندان کے قبضہ میں آیا۔ ۱۵۰۷ میں یہاں سمندر کے راستہ سے پرتگالی داخل ہوئے۔ ۱۶۶۱ میں جزیرہ بمبئی انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ ایک عرصہ تک وہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام رہا۔ ۱۸۵۷ میں پہلی سوتی مل یہاں قائم ہوئی۔

بمبئی میں میں "جوہو اسکیم" کے علاقہ میں ٹھہرا تھا۔ یہاں ہندوؤں کا اوپر کا طبقہ اور کچھ اعلیٰ طبقہ کے مسلمان رہتے ہیں۔ مختصر قیام کے دوران یہاں اس طبقہ کے لائف اسٹائل کو دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ اس اختلاط کے دوران یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہندو۔ مسلم اشوز کو اگر محدود دائرہ میں رکھا جائے، ان کو قومی پرسٹیج کی حد تک نہ پہنچنے دیا جائے تو ہندوؤں کا اوپر کا طبقہ ان معاملات میں غیر جانب دار رہے گا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کے اوپر کے طبقہ کا وزن اس قسم کی تحریکوں کو نہ ملے تو اس کی واحد یقینی تدبیر یہ ہے کہ ان کو قومی پرسٹیج کی حد تک جانے سے روکا جائے۔

مثلاً اجودھیا کے مسئلہ کو اگر اجودھیا تک محدود رکھا جاتا، شاہ بانو بیگم کے معاملہ میں ملکی اندولن نہ چلایا جاتا تو فرقہ پرست یا تشدد پسند عناصر کو اوپر کے طبقہ کے ہندوؤں کا تعاون ہرگز نہ ملتا۔

بمبئی میں مسٹر ایس آر سنگھوی (Tel. 750866, 750625) سے ملاقات ہوئی۔ وہ کلکتہ میں رہتے ہیں اور اکسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ انھوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ کلکتہ کا پروگرام بنائیے۔ ہم اس میں پورا تعاون دیں گے۔

انھوں نے بتایا کہ ان کی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ یہاں کالج میں مسلم لڑکے بھی تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا تھا۔ کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے بھائی کی طرح ملتے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی ہندو مسلم ذہن کے ساتھ نہیں سوچتا تھا۔ مگر ۵۔ ۶ سال میں بہت زیادہ فرق آگیا۔ ایک دوسرے کے درمیان بہت دوری

آگئی۔ یہ اس وقت ہوا جبکہ ایک طرف بابری مسجد تحریک اٹھی، اور دوسری طرف رام مندر تحریک شروع ہوئی۔ ان تحریکوں نے سارے ماحول میں زہر گھول دیا۔

گویا کہ موجودہ فرقہ وارانہ منافرت نہ مسلم دورِ حکومت کی دین ہے اور نہ ملک کے بٹوارہ کا نتیجہ۔ وہ قریب کی بعض تحریکوں کا نتیجہ ہے جو نہایت غیر دانش مندانہ انداز میں چلائی گئیں۔ کچھ فرقہ پرست ہندو اگر ماضی کی بعض باتوں کو آج دہرا رہے ہیں تو اس کی حیثیت حقیقۃً نکتہ بعد الوقوع کی ہے۔

ظہر کی نماز کے بعد مسٹر خوراکی والا (شریف بمبئی) نے لنچ پر شہر کے کچھ خاص لوگوں کو بلایا تھا۔ یہاں موجودہ حالات پر لوگوں سے گفت گو ہوئی۔ مسٹر خوراکی والا نے گفت گو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ملک جدھر جا رہا ہے اس پر سب کو دکھ ہے۔ اب ہمیں سوچنا ہے کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔ عمومی تاثر یہ تھا کہ ذاتی مفاد اور پارٹی پالی ٹکس سے اوپر اٹھ کر دیش کے مفاد کو سپریم بنانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ قومی مستقبل کی تعمیر ممکن نہیں۔

آج دن میں شہر کی کئی ممتاز شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ ہر ایک نے "تین نکاتی فارمولا" سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کو ملک میں امن کے قیام کا ذریعہ بتایا۔

شام کو ۵ بجے جم خانہ کلب کے ہال میں عمومی اجتماع ہوا۔ تمام سیٹیں پوری طرح بھری ہوئی تھیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد، ہندو اور مسلم دونوں بڑی تعداد میں اکٹھا ہوئے۔ مقررین میں میرے علاوہ اچاریہ سوشیل کمار، سوامی چیدانند، نانی پالکھی والا، کارڈینال سائمن پمینٹا، لو ما لوپ ژنگ اور ایف ٹی خوراکی والا تھے۔

مسٹر سعید نقوی نے اپنی تقریر میں بتایا کہ میں فیض آباد کا رہنے والا ہوں جو اجودھیا کے پڑوس میں ہے۔ مگر ۱۹۸۶ کے ایجی ٹیشن سے پہلے تک میرے والدین کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بابری مسجد کہاں ہے۔ یہ صرف تحریکوں کی دھوم تھی جس نے لوگوں کو اس سے باخبر کیا۔

پالکھی والا نے اپنی تقریر میں کہا انڈیا میں اس وقت آپس کے جو جھگڑے ہیں وہ شرمناک حد تک بے معنی ہیں۔ ہم کو اگر ترقی کرنا ہے تو ہمیں ان آپسی جھگڑوں کو ختم کرنا ہوگا۔ انھوں نے

اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی : یا تو بھائیوں کی طرح زندگی گزاریئے یا جانوروں کی طرح مر جائیے :

Live as brother or die as animals.

میں نے اپنی تقریر میں تین نکاتی فارمولے کی تشریح کی۔ آخر میں اچاریہ سوشیل کمار مائک پر آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں میں سے جن لوگوں کو فارمولے سے اتفاق ہے وہ ہاتھ اٹھائیں۔ اچانک کچھ مسلمان اٹھ کر شور کرنے لگے۔ ان کے شور میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ صرف یہ سنائی دیا کہ : ہم مولانا کے فارمولے کو نہیں مانتے۔

اس کے بعد سوامی چیدانند اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں میری حمایت کی۔ اس سے لوگ ٹھنڈے ہوئے۔ اس کے بعد نانی پالکھی والا آئے۔ انھوں نے شاندار انگریزی تقریر میں میری زبردست حمایت کی۔ ان کی تقریر نہایت علمی اور نہایت موثر تھی۔ اس کے بعد مجمع بالکل خاموش ہو گیا۔

۲۰ فروری ۱۹۹۳ کو بمبئی کے مذکورہ جلسہ میں جس مسلمان بزرگ نے سب سے زیادہ ہنگامہ برپا کیا، وہ مولانا ضیاء الدین بخاری تھے۔ موصوف ابتداءً ایک "معمولی اور گم نام ٹیچر تھے۔ اس کے بعد وہ بمبئی کی مسلم سیاست کے میدان میں آئے۔ اپنی جوشیلی تقریروں کے ذریعہ انھوں نے مقامی مسلم حلقوں میں کافی شہرت حاصل کی۔ وہ "بیباک مسلم لیڈر کے روپ میں ابھرے۔ اور ایک صحافی کے الفاظ میں، بمبئی کے مسلمانوں کی مزاحمتی سیاست کی علامت بن گئے۔ (ہندستان، بمبئی، ۲۱-۲۲ اپریل ۱۹۹۳)

۲۰ فروری کے جلسہ میں انھوں نے اتنا شور کیا کہ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ دو ماہ بعد ۲۱ اپریل ۱۹۹۳ کو یہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ بمبئی کے علاقہ بائی کلہ کی فائن پیلس بلڈنگ میں واقع ان کے دفتر میں چار مسلح لوگ داخل ہوئے اور ریوالور سے مسلسل فائر کر کے ان کو ہلاک کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بمبئی کے سفر پر روانگی سے پہلے بمبئی سے کئی ٹیلیفون آئے تھے کہ آپ بمبئی نہ آئیں۔ یہاں کچھ افراد آپ سے بہت ناراض ہیں۔ وہ آپ کے خلاف کچھ بھی حرکت کر سکتے ہیں۔ تاہم میں اللہ کے بھروسے پر بمبئی گیا۔ جس وقت ہال میں کچھ مسلمان ہنگامہ کر رہے تھے اور میں اسٹیج پر

خاموش بیٹھا ہوا تھا، ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ کسی بھی طرف سے گولی آسکتی ہے اور یہیں میرا خاتمہ کرسکتی ہے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ میرے دل میں اس وقت ذرا بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ جلسہ ختم ہوتے ہی اسٹیج کا پردہ اس کے ذمہ داروں نے کھینچ دیا۔ اس کے بعد دو پولیس افسر میرے دائیں اور بائیں آگئے۔ وہ باہر گاڑی میں سوار ہونے تک مسلسل میرے ساتھ رہے۔

۲۰ فروری کی شام کو میں مسٹر افضل الانہ کی گاڑی میں ایئرپورٹ جانے کے لئے بیٹھا۔ عین اسی وقت دو ہندو نوجوان گاڑی میں داخل ہوئے اور میرے دائیں اور بائیں بیٹھ گئے۔ یہ دونوں میرے لئے نئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم آپ کی حفاظت کے لئے یہاں بیٹھے ہیں۔ ایک نوجوان نے کہا: مولانا جی، یدی کوئی آپ پر گولی چلاتا ہے تو وہ گولی پہلے ہمارے سینہ کو چھیدے گی۔ اس کے بعد ہی وہ آپ تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ لوگ ایئرپورٹ کے دروازہ تک میرے ساتھ رہے۔

شام کو فلائٹ نمبر ۱۸۳ کے ذریعہ بمبئی سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ کسی قدر لیٹ ہو کر جہاز نے ۹ بجے بمبئی سے پرواز شروع کی۔ راستہ میں چند اخبار ہندی اور انگریزی کے دیکھے۔ ہندی اخبار سندھیہ ٹائمس (۲۰ فروری ۱۹۹۳) میں ایک تفریحی کالم ہوتا ہے۔ اس کا عنوان ہے: اٹ پٹے سوال، چٹ پٹے جواب۔ اس کے دو سوال وجواب اس طرح تھے:

سوال: جب دنیا کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں تو اس وقت راستہ کون دکھاتا ہے۔

جواب: ہمت۔

سوال: یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مگر ایک مہاشے کو شکایت ہے کہ لگاتار پانچ ورشوں کی کڑی محنت کے بعد بھی پھل کڑوا ہی ملا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔

جواب: پانچ سال میں محنت سے کریلے ہی بوئے ہوں گے۔

۲۰ فروری ۱۹۹۳ کی رات کو میں دہلی واپس پہنچا۔ تاخیر کا سبب یہ تھا کہ جہاز غیر معمولی طور پر کئی گھنٹہ لیٹ ہوگیا۔ مگر مجھے ذاتی طور پر اس کا نقصان نہیں ہوا۔ کیوں کہ مجھے اس کی اطلاع بمبئی میں پیشگی طور پر مل گئی تھی اور میں نے اس وقت کو بمبئی میں استعمال کر لیا تھا۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	-
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	[illegible]
ظہور اسلام	[illegible]
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات	50/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسول	-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-
ڈائری جلد اول	-
ڈائری جلد دوم	-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-

انوار حکمت	-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
شخصیات اسلام	-
تعدد ازدواج	3/-

روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	7/-
صداقت اسلام	-
علماء اور دور جدید	8/-
ہندستانی مسلمان	7/-
سیرت رسول	-
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
اسلام کا تعارف	4/-

ہندی

سچائی کی تلاش	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	6/-
پیغمبر اسلام	3/-

عربی

الاسلام یتحدی	85/-
الاسلام والعصر الحدیث	-
منزل کی اور	

آڈیو کیسٹ

A-1	حقیقت ایمان	25/-
A-2	حقیقت نماز	25/-
A-3	حقیقت روزہ	25/-
A-4	حقیقت زکوٰۃ	25/-
A-5	حقیقت حج	25/-
A-6	سنت رسول	25/-
A-7	میدان عمل	25/-
A-8	پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9	اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10	اسلامی اخلاق	25/-
A-11	اتحاد ملت	25/-
A-12	تعمیر ملت	25/-
A-13	نصیحت لقمان	25/-
A-14	متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15	متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16	متفرق سورتیں ۳	30/-

ویڈیو کیسٹ

V-1	پیغمبر انقلاب	200/-
V-2	اسلام داعی امن	200/-
V-3	اسلام دور جدید کا خالق	-
V-4	امت مسلمہ اور جدید چیلنج	-
V-5	اسلام اور سماجی انصاف	-
V-6	اسلام اور دور حاضر	-

God Arises	Rs 85/-
Muhammad The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	-
Indian Muslims (Hb)	145/-
Indian Muslims (Pb)	55/-
Introducing Islam	-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	-
Islam the Creator of Modern Age	-
The Way of Find God	6/-
The Teachings of Islam	7/-
The Good Life	7/-
The Garden of Paradise	7/-
The Fire of Hell	7/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	6/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of Wisdom	-

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

1982 سال	100/-
1985	100/-
1986	100/-
1987	100/-
1988	100/-
1989	100/-
1990	100/-
1991	100/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984 تا 1991 — 100/- فی جلد

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

1990-91 — 100/-